شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں

شبلی اکادمی، قرولباغ، دہلی

مولانا شبلی کا مرتبہ اُردو ادب میں

مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں

عبداللطیف اعظمی بی اے جامعہ

شبلی اکادمی، قرول باغ، دہلی

طبع اول ۱۵۰۰

قیمت سے

انتساب

اپنے شفیق اور محترم استاد مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کے نام۔ میری ابتدائی قلمی و ادبی تربیت دراصل مولانا ہی کے فیض صحبت کی رہین منت ہے۔

اعظمی

فہرست مضامین

پیش لفظ — ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب

دیباچہ — مصنّف

مقدمہ — پروفیسر آل احمد صاحب سُرور صدیقی

حصۂ نثر

۱	نثر اردو کا آغاز و نشو و نما	۱۹
۲	اردو کی ترقی میں سرسید کا حصّہ	۲۱
۳	پروفیسر آزاد	۳۳
۴	مولانا نذیر احمد	۳۷
۵	مولانا حالی	۴۲
۶	مولانا حالی اور مولانا شبلی کی معاصرانہ چشمک ؟	۵۵

۷	مولانا حالی کی بقیہ کتابیں	۶۳
۸	مولانا شبلی	۶۷
۹	تاریخ و سوانح	۷۵
۱۰	علم کلام	۹۴
۱۱	تنقیدات ادب	۹۷
۱۲	مکاتیب شبلی	۱۰۳
۱۳	تعلیمی اصلاحات	۱۲۱
۱۴	شبلی پر مغرب کا اثر	۱۳۶

حصہ شاعری

۱۵	قدیم شاعری	۱۴۷
۱۶	جدید رجحانات	۱۵۰
۱۷	سیاسی نظمیں	۱۵۱
۱۸	سیاسی شاعری اور شبلی کے ہم عصر	۱۶۸
۱۹	مذہبی اور تاریخی نظمیں	۱۷۹
۲۰	متفرق نظمیں	۱۸۵
۲۱	غزلیں	۱۹۴
۲۲	طنزیہ شاعری	۱۹۶
۲۳	خلاصہ کلام	۲۰۲
۲۴	انڈکس (اشاریہ)	۲۰۹

پیش لفظ

قوموں کی زندگی جب تاریخ کے ایک دور سے دوسرے دور میں داخل ہونے لگتی ہے، تو اس کے ذہنی قائدوں میں قدامت پسندوں کے علاوہ، دو قسم کے لوگ اور نظر آتے ہیں، ایک وہ جو قدیم اور جدید میں امتزاج کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جو اس پر اکتفا کرتے ہیں کہ قدامت میں کوئی ترمیم کئے بغیر محض تھوڑی بہت تاویل کرکے اُسے جدّت کے رنگ میں پیش کریں۔ مولانا شبلی مرحوم دوسری قسم کے اربابِ فکر کے سرگروہ تھے۔

تاویل منطقی بھی ہو سکتی ہے اور شاعرانہ بھی۔ مگر ان دونوں کے اثر کے دائرے محدود ہیں۔ شبلی نے مجرد منطقی فکر کو مصوّر شاعرانہ تخیّل میں سمو کر ایک ایسا دلکش اسلوبِ بیان ایجاد کیا، جس نے ان کی تحریر کے دائرۂ اثر کو بہت وسیع کر دیا۔ یہ اسلوب تخیل کے تاریک گوشوں پر عقل کی روشنی ڈالتا ہے، فکر کے بے رنگ خاکوں میں شعر کا رنگ بھرتا ہے اور جس طرح دوربین مکان کے فصل کو مٹا دیتی ہے، یہ زمانے کے فصل کو مٹا کر ماضی کو حال بنا دیتا ہے۔ یوں تو شبلی شاعر بھی تھے اور نقاد بھی، مورخ بھی تھے اور سیرت نگار بھی، معلم بھی تھے اور مصلح بھی، مگر ان کی یہ سب حیثیتیں تابع تھیں ایک مرکزی حیثیت کے وہ اسلامی تہذیب کے ترجمان تھے، جو ماضی کی زبان میں ترجمہ کرتے تھے۔ اس

ترجمے کی علمی صحت یعنی حرف بہ حرف اصل سے مطابقت، ایک بحث طلب امر ہی لیکن اس کی ادبی لطافت، زور اور اثر میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا۔ اپنے کمالِ انشاپردازی کو انھوں نے اس مقصد کے لیے استعمال کیا کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کے تہذیب مغرب سے مسحور دل و دماغ کو تہذیب اسلامی کے تصور سے مانوس کر دیں، اور اس میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔

غرض شبلی کی ادبی حیثیت جس کو عبد اللطیف اعظمی صاحب نے اس چھوٹی سی کتاب کا موضوع بنایا ہی، ان کی ہمہ رنگ اور ہمہ گیر شخصیت کا سب سے اہم اور سب سے دلچسپ پہلو ہی۔ اعظمی صاحب کی یہ کوشش حقیقی معنی میں طالب علمانہ کوشش ہی۔ (اس لئے کہ انھوں نے یہ مقالہ بی اے کے امتحان کے لئے لکھا تھا) اور اس کو اسی معیار پر جانچنا چاہیئے، اس کے علاوہ اس کا بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ اعظمی صاحب شبلی کے بے لاگ نقاد نہیں، بلکہ پُر جوش معترف ہیں، اس لئے اگر شبلی اور ان کے معاصرین میں مقابلہ کرتے وقت ان کی تحریریں وکالت کی جھلک نظر آئے تو وہ معذور ہیں۔ پھر بھی کتاب اپنے موضوع اور لکھنے والے کے خلوص کی وجہ سے دلچسپی اور افادے سے خالی نہیں اور ان لوگوں کو جنھیں مولانا سید سلیمان ندوی کی جید تصنیف کے مطالعہ کی قابلیت یا فرصت نہیں، بہت غنیمت معلوم ہوگی۔ اگر یہ ان میں سے بعض کو "حیات شبلی" کے پڑھنے کا اور خود مولانا شبلی کی تصانیف کے مطالعہ کا شوق دلا سکے تو یہ بجائے خود ایک بڑی خدمت ہی۔

سید عابد حسین

مئی ۱۹۴۵ء

دیباچہ

پیش نظر کتاب، شبلی پر کوئی جامع تصنیف نہیں بلکہ ایک مختصر مقالہ ہے جو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے امتحان بی،اے کے سلسلہ میں سنہ ۴۱ء میں لکھا گیا تھا۔ یہ محض ایک طالب علمانہ کوشش ہے۔ اور بہت ہی عجلت میں ترتیب دیا گیا ہے۔ اگر آپ کا خیال ہو کہ یہ مقالہ اردو ادب میں مولانا شبلی کا مرتبہ متعین کرنے اور ان کی علمی خدمات کو اجاگر کرنے میں کامیاب ہوگا، تو آپ کو شاید مایوسی ہوگی۔ شبلی جیسے ادیب اور نقاد، مورخ اور سوانح نگار، ماہر تعلیم اور مصلح تعلیم پر کچھ لکھنے کے لئے جن اہلیتوں کی ضرورت ہے، وہ میں اپنے میں نہیں پاتا، اگر اسے میری جسارت سمجھئے یا وطنی عصبیت کہ اپنی کم علمی اور تہی مائگی کے باوجود اسے آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔

اس مقالے کو لکھے ہوئے ایک مدت ہوگئی مگر میری غیر معمولی مشغولیت

نے نظرثانی کا بھی موقع نہیں دیا۔ البتہ اس عرصے میں رسالوں اور کتابوں میں اپنی تائیدیں، جو کچھ نظر سے گذرا، اس کا اضافہ کر دیا ہے۔ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کی مبسوط تالیف "حیات شبلی" اسی درمیان میں شائع ہوئی، جو شبلی پر کام کرنے والوں کے لئے بہترین مواد کا کام دے سکتی ہے۔ مقالہ لکھنے سے پہلے اس کا مسودہ میں نے سرسری طور پر دیکھا تھا، چنانچہ کسی موقع پر اس کا ایک حوالہ بھی موجود ہے۔

شبلی جیسی شخصیت، کسی زبان کو بہ مشکل نصیب ہوتی ہے۔ بقول علامہ اقبال

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مگر یہ ہماری بدقسمتی اور احسان ناشناسی ہے کہ شبلی کی خدمات کا جس طرح اعتراف کرنا چاہیئے تھا، ہم نے نہیں کیا۔ عرصہ کی بات ہے کہ میری ہی طرح جامعہ کے ایک فرزند اور مولانا شبلی کے ہم وطن جناب سعید انصاری صاحب نے "الناظر" کے انعامی مقابلہ کے سلسلہ میں ایک رسالہ لکھا تھا، جس میں انھوں نے سب سے پہلی بار اردو کے عناصر اربعہ میں (آزاد، نذیر احمد، حالی، شبلی)، شبلی کا درجہ دکھایا ہے، مگر ملک کو اب اپنی اس غلطی کا احساس آہستہ آہستہ ہو چلا ہے چنانچہ ۱۰ر نومبر ۱۹۴۳ء کو سب سے پہلے خود شبلی کے وطن یعنی اعظم گڈھ میں، شبلی انٹر کالج کے زیر اہتمام یوم شبلی منایا گیا۔ اس کے بعد گذشتہ سال ۲۳ر نومبر کو بمبئی میں اور امسال ۱۰ر فروری کو لاہور میں اسی قسم کے جلسے منعقد ہوئے اور

اب جامعہ کے طلبائے ثانوی یوم شبلی کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ شبلی کی یادگار دار المصنفین سے حیات شبلی کے نام سے ایک ضخیم کتاب شائع ہوئی، مسلم یونیورسٹی کے پی ایچ ڈی کے ایک طالب علم نے شبلی پر مقالہ لکھا ہے اور سنا ہے مولانا اقبال احمد صاحب سہیل اپنی نامکمل تصنیف سیرت شبلی، مکمل کر رہے ہیں اور ان کے علمی خدمات پر بھی ایک تنقیدی کتاب لکھ رہے ہیں، یہ تمام چیزیں ہوا کے رُخ کا پتہ دے رہی ہیں اور اردو ادب کے لئے فال نیک ہیں۔

اس مقالہ کے سلسلہ میں، میں بہت سے لوگوں کا ممنون احسان ہوں، جس کا یہاں اعتراف نہ کرنا، احسان ناشناسی ہوگی، سب سے پہلے ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کا شکریہ ادا کرنا ہے، جن کی زیر نگرانی میں نے اسے مرتب کیا ہے۔ اس کے بعد پروفیسر آل احمد صاحب سرور، مولانا اقبال احمد صاحب سہیل اور پروفیسر سعید انصاری صاحب کا، جنھوں نے نہایت خلوص اور محنت سے اس مقالہ کو دیکھا اور اپنے مفید مشوروں سے مستفید فرمایا اور ڈاکٹر عابد صاحب اور پروفیسر سرور صاحب نے نظر ثانی کے علاوہ، اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود اس کے لئے دیباچے لکھنے کی بھی تکلیف گوارا فرمائی۔ میں مجلس تعلیمی جامعہ ملیہ کا بھی ممنون ہوں، جس نے اس مقالہ کی طباعت و اشاعت کی اجازت دی اور برادرم عبدالرحمان صاحب اصلاحی جامعی کا بھی جنھوں نے اس کی طباعت

واشاعت کے سلسلہ میں قابل قدر مدد فرمائی۔ مولانا سید عبدالقادر صاحب
ناظم مکتبہ نشاۃ ثانیہ حیدرآباد اور محترم بھائی لطف الرحمان صاحب اعظمی
کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے، جن کی عنایت سے آج میں اس قابل ہوا
کہ یہ کتاب آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

عبداللطیف اعظمی

کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
۲۰ مئی ۱۹۴۵ء

مقدمہ

شبلی پر کچھ لکھنے کے لئے کسی اعتذار کی ضرورت نہیں۔ وہ ہماری ذہنی زندگی کے معماروں میں سے ہیں۔ انھوں نے اپنی عمر کے چالیس سال علمی کاموں میں بسر کئے، انھوں نے بہت سے عملی کام بھی کئے اور ان میں کامیابی بھی حاصل کی مگر وہ محض اپنے عملی کاموں کی وجہ سے شاید اتنے مشہور نہ ہوتے، اگر ان کاموں کے پیچھے ایک مسلسل، اہم اور پرزور علمی و ذہنی تحریک نہ ہوتی۔ مہدی افادی نے انھیں "تاریخ کا معلم اول" کچھ غلط نہیں کہا ہے، انھوں نے اردو میں تاریخی ذوق پیدا کیا، خود بڑی اچھی سوانح عمریاں اور تاریخیں لکھیں اور تحقیق و تدقیق واقعات کی چھان بین اور مآخذ کی تلاش، اور تاریخ میں ایک صاف اور واضح نقطہ نظر ان سب کی اہمیت دکھائی اور جتائی۔ انھوں نے ادب، سیاست، تعلیم، مذہب فلسفہ، سب کو متاثر کیا اور سب پر اپنا کچھ نہ کچھ نقش چھوڑا۔ وہ بڑی جامع اور ہمہ گیر طبیعت رکھتے تھے۔ انھوں نے اردو نثر کا دامن بہت وسیع کیا اور اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے نظم میں بھی، اپنی رنگین پرجوش اور مزے دار، سیاسی، اخلاقی اور تاریخی نظموں سے ایک خوشگوار اضافہ کیا۔ ان کے اسلوب میں ایک شگفتگی، بانکپن اور چستی ملتی ہے۔ شبلی کے یہاں عالمانہ

شان ہی، مگر خشکی نہیں، شبلی زاہد خشک نہیں تھے، وہ شاعر بھی تھے۔

حیرت ہے کہ شبلی کے کارناموں کے عام اعتراف، ان کی مقبولیت اور ان کے اثر کے باوجود شبلی پر ابھی تک کوئی مفصل اور سیر حاصل تنقید نہیں ملتی۔ گذشتہ سال سید سلیمان ندوی کے قلم سے "حیات شبلی" شائع ہوئی ہے جو تقریباً نو سو صفحے کی ایک ضخیم کتاب ہے مگر اس میں صرف شبلی کی زندگی کے حالات اور اس زمانہ کے اہم واقعات کا تذکرہ ہے، غالباً تنقید دوسری جلد میں ہوگی۔ حیات شبلی بڑی محنت سے لکھی گئی ہے اور بذاتِ خود ایک علمی کارنامہ ہے، مگر یہ ایک طور پر شبلی کی سرکاری سوانح عمری ہے، جو ان کے سب سے بڑے جانشین نے لکھی ہے، مولانا اقبال احمد سہیل کی کوشش چند مضامین سے آگے نہ بڑھ سکی اگر مولانا کی لااُبالی طبیعت نے کبھی ان کو جم کر اپنے تاثرات قلم بند کرنے کا موقع دیا، تو یہ ایک دل چسپ اضافہ ہوگا۔ ان بزرگوں کے سامنے ایک نوجوان کی کوشش، جو اس کے اپنے الفاظ میں طالب علمانہ بھی ہے، اور مختصر بھی، بظاہر بہت وقیع نہیں معلوم ہوتی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مؤلف نے جس طرح شبلی کے علمی وادبی کارناموں پر عام اردو داں طبقے کے لئے روشنی ڈالی ہے وہ لائق تحسین ہے اور اگر اس کتاب سے ان لوگوں میں جو اس کام کو بہتر طور پر انجام دے سکتے ہیں، شبلی کی صحیح اور اصلی تصویر پیش کرنے کا جذبہ پیدا ہو، تو یہ ایک بڑی خدمت ہوگی۔

ہم لوگوں میں یہ ایک عام کمزوری ہے کہ پہلے انسانوں کے بت بناتے ہیں اور پھر ان بتوں کو آپس میں ٹکرا کر خوش ہوتے ہیں۔ خدا جانے کس گھڑی میں،

مہدی افادی نے حالی اور شبلی کی معاصرانہ چشمک کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا کہ اب ادبی حلقوں میں حالی اور شبلی کا موازنہ اور ایک کو دوسرے سے بڑھانے یا گھٹانے کی کوشش، اچھا خاصا فرض بن گئی ہے۔ جیسا کہ لطیف صاحب نے لکھا ہے دراصل اس قسم کی کسی چشمک کا کوئی وجود نہیں ہے، حالی کو کسی سے چشمک کیا ہوتی وہ تو انسان نہیں فرشتہ تھے، جب ان پر کوئی نوجوان تیزی میں آکر اعتراض کر بیٹھتا، جیسا کہ ایک دفعہ حسرت نے کیا تھا، تو وہ اس صبر و سکون سے سنتے کہ معترض اور شرمندہ ہوتا۔ شبلی سے تو انھیں بڑی محبت تھی، انھوں نے جہاں دو ایک جگہ شبلی کی رائے، یا ان کے اصولوں سے اختلاف کیا ہے، یا انھیں شبلی کے کسی اعتراض کا جواب دینا پڑ گیا ہے، وہاں کم سے کم الفاظ میں اپنی رائے بیان کرکے آگے بڑھ گئے ہیں۔ دراصل یہ چشمک ان دونوں بزرگوں میں اتنی نہ تھی، جتنی ان کے جانشینوں میں ہے، مگر اس کی وجوہ اور ہیں۔ یہاں شبلی کا ایک قول نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، جو سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں درج کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شبلی جو اپنے آپ کو خاصا لئے دیئے رہتے تھے، حالی کے معاملے میں کس قدر گھل جاتے ہیں اور کیسے زوردار الفاظ استعمال کرتے ہیں:-

> "میں دریا ہوں اور حالی کنواں ہیں۔ میرا علم دریا کی طرح وسیع ہے اور حالی کے پاس معلومات اگرچہ کم ہیں، لیکن وہ گہرے ہیں، جب تک کافی مواد تحریر موجود نہ ہو، میں ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔ مگر حالی کی نکتہ آفرینی اس کی محتاج نہیں، ان کی دقیقہ رس اور نکتہ سنج

طبیعت ایسی جگہ سے مطلب نکال لاتی ہے، جہاں ذہن بھی منتقل نہیں ہوتا اور یہ کمالِ اجتہاد کی دلیل ہے۔" (حیات شبلی ص۸۰۲)

انھی سید سلیمان نے شبلی کی زبانی ایک واقعہ لکھا ہے: "فرماتے تھے کہ جاحظ کی کتاب البیان والتبیین جب نئی نئی چھپ کر آئی، تو مجھے وہ بے ترتیب اور پراگندہ معلوم ہوئی۔ رات کو مولانا حالی آئے وہ کتاب مانگ کر لے گئے، صبح کو واپس کی تو فرمایا کہ "یہ نثر کا حماسہ ہے"۔ مولانا کہتے تھے کہ ان کے اس ایک فقرے نے کتاب کے موضوع کو میرے سامنے آئینہ کر دیا اور اس کی ترتیب کا وہ پہلو میرے سامنے آگیا۔ جو پہلے سامنے نہ تھا۔"

(حیات شبلی صفحہ ۸۰۱)

حیاتِ سعدی، یادگارِ غالب، سب کو شبلی نے مبالغہ آمیز الفاظ میں سراہا ہے۔ صرف حیات جاوید کے متعلق ان کی رائے اچھی نہیں، لیکن اس کی وجہ سوانح نگار سے بدظنی نہ تھی، بلکہ خود ہیرو کے بعض معاملات میں اختلاف تھا، مصور پسند تھا، اس کی ایک تصویر کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔

اکرام نے موجِ کوثر میں لکھا ہے :-

"ندوہ ایک زمانے میں علی گڑھ کا سب سے بڑا حریف ہو گیا تھا اور وہ بھی ایک ایسے بزرگ کی بدولت جس نے مدتوں علی گڑھ میں فیض حاصل کیا تھا، .... یہ امر واقعہ ہے کہ شبلی کا دل سر سید کی طرف سے صاف نہیں معلوم ہوتا اور علی گڑھ سے علیحدہ ہو جانے کے بعد، انھوں نے بالعموم سر سید سے انصاف نہیں کیا ....

شبلی کو علی گڈھ تحریک کا سب سے بڑا مخالف خیال کیا جا سکتا ہے.....

...... علی گڈھ تحریک کے خلاف جو ردِّ عمل ہوا، اس کی بنا و تنظیم میں مولانا شبلی کو بڑا دخل تھا۔" (موجِ کوثر ۱۳۶ - ۱۴۳)

ان حوالوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگر جنگ تھی تو سرسید اور شبلی کی تھی۔ اس پر میں ذرا تفصیل سے لکھنا چاہتا ہوں، کیونکہ اکرام نے شبلی کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے، انھوں نے سطح پر اختلافات کو دیکھا ہے اور یہ نظر انداز کر دیا ہے کہ اس کے وجوہ کس قدر گہرے، بنیادی اور اساسی تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سرسید اور شبلی کی طبیعت میں بہت فرق تھا۔ سرسید اپنے ساتھیوں اور رفیقوں کی ایسی تعریف کرتے تھے کہ انھیں آسمان پر بٹھا دیتے تھے۔ سرسید نے شبلی کی بھی بہت تعریف کی اور المامون کے دیباچے میں ان کی زبان اور ان کے تاریخی شعور دونوں کو سراہا ہے، یہ بھی صحیح ہے کہ شبلی کو شبلی سرسید نے بنایا، شبلی مغرب تک سرسید کے واسطے سے پہنچے، سرسید کے کتب خانے، ان کی صحبت، علی گڈھ کی علمی صحبتوں اور آرنلڈ کی رفاقت نے شبلی کو ایک نیا ذہن اور ایک نیا مزاج دیا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کی سخت حنفیت سرسید کے اثر سے اعتزال اور عقلیت میں تبدیل ہو گئی لیکن ایک زمانہ وہ آتا ہے، جب سرسید کی ذہنی قیادت پیرِ تسمہ پا کا کام کرتی ہے اور شبلی اس سے آگے بڑھ جاتے ہیں، شبلی نے سرسید کی تعریف میں صبح امید لکھی، لیکن ان کی سوانح لکھنے سے صاف انکار کر دیا۔ پھر ان کے مرنے پر صرف اردو ادب پر ان کے احسانات بیان کیے اور کچھ نہ لکھا۔

حالی بھی ایک زمانے میں حیات جاوید لکھنے کا ارادہ ترک کر چکے تھے اور سرسید کے مرنے سے کچھ پہلے، پیسہ اخبار میں ان کا، وقار الملک، اور محسن الملک کا ایک بیان سرسید کے خلاف نکلنے والا تھا کہ ان کی وفات کی خبر نے قدرتی طور پر اسے روک دیا، حیات جاوید پر اعتراضات محض اس وجہ سے نہیں ہیں کہ شبلی کو سرسید سے پرخاش تھی، بلکہ وہ دور آخر کے سرسید کی پالیسی سے متفق نہ تھے اور حالی نے باوجود اپنی انصاف پسندی کے، ایک قومی ضرورت اور مصلحت کے ماتحت سرسید کے ہر کام کی تاویل کی۔ شرر کا خیال یہ ہے کہ وہ سرسید کی فوج کے ایک نامی پہلوان ہونا گوارا نہ کرتے تھے، انھیں خود قیادت کی ہوس تھی۔ ممکن ہے شبلی کی نفسیات سے وہ اچھی طرح واقف ہوں، لیکن میرا خیال ہے کہ شبلی جس دبستاں کے فرد تھے، وہ سرسید سے متاثر ہوتے کے باوجود، سرسید کی ہر معاملے میں تقلید اور ہم نوائی نہیں کر سکتا تھا، شبلی محسن الملک نہ تھے، جو سرسید کے سجادہ نشین ہونا چاہتے ہوں، وہ سرسید کے جانشین ہو بھی نہیں سکتے تھے۔

بات یہ تھی کہ شبلی پرانے اسکول کا وہ ستارہ تھے، جو اپنی فضا سے ٹوٹ کر، سرسید کی دنیا میں پہنچ گیا تھا، مگر اپنی دنیا کی کچھ چیزیں بھی ساتھ لیتا گیا تھا۔ شبلی قدیم علوم کے فاضل تھے، سرسید نہ تھے، شبلی نے جس گہوارے میں پرورش پائی تھی، وہ کچھ زیادہ سرکار پرست نہ تھا، سرسید مشرق اور مغرب کے ملاپ کی خاطر سرکار پرست بنے تھے۔ یہ ان کا نئی نسل پر بہت بڑا احسان ہے وہ اس دور کے بانی اور رہنما ہیں، ان کی تحریک سے ہماری مردہ زندگی میں کتنی زندگی پیدا ہوئی، اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں، لیکن ۱۸۵۷ء

اور ۱۸۸۶ء میں کچھ فرق ہونا چاہیئے تھا۔ سرسید کی سیاست اس فرق کو نمایاں کرنے کے خلاف تھی۔ شبلی کو عربوں اور ترکوں سے بڑی محبت تھی "۔ عربوں سے اس لئے کہ وہ اسلام کے پہلے معمار ہیں، ترکوں سے اس وجہ سے کہ وہ اس زمانے میں اسلام کے ظاہری اقتدار کے نمائندے تھے۔" سرسید نے مسلمانوں کی دنیا سنبھالی، شبلی نے ان کی دنیا کے ساتھ ان کے دین کی بھی فکر کی۔ سرسید انگلستان گئے، شبلی کے لئے انگلستان جانا، ناممکن تھا، تاہم وہ روم و مصر و شام گئے، اکبر کے الفاظ میں ایک نے خدا کی شان دیکھی، دوسرے نے خدا کو دیکھنے کی کوشش کی۔ سرسید نے ترکوں کے خلاف ایک مضمون لکھا، شبلی نے ان کے ملک کی سیر کے حالات علی گڈھ میں فخریہ بیان کیئے اور ان کی حمایت میں تقریریں کیں اور نظمیں لکھیں۔ سرسید انگریزوں کے بڑے مداح اور انگریزی طریقۂ حکومت کے بہت بڑے طرفدار تھے، شبلی انگریز پرستی سے چڑتے تھے۔ سرسید کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے بھی، ان کی آخر عمر کی سیاست سے، جب وہ بیک کے اشاروں پر حرکت کرتے تھے، اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ شبلی سرسید کی لایف اس لئے نہ لکھ سکتے تھے کہ وہ سرسید سے کچھ آگے دیکھ رہے تھے۔ سرسید کا دور، علی گڈھ تحریک کا پہلا دور ہے، شبلی کا دوسرا۔ اس فرق کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔

شبلی نے علی گڈھ کو چھوڑا اور ندوے کی دنیا آباد کی۔ یہ بھی محض خودسری نہ تھی، ایک سنجیدہ مقصد اس کی تہہ میں تھا، سرسید نے نئی تعلیم اس لئے نہیں شروع کی تھی کہ انگریزی، دفتری حکومت کی مشین کے لئے تیل مہیا کریں یا

بوڑھے بچوں کے جہل مرکب کا سامان کریں، یا انگریزی حکومت کی بنیادوں کو استوار کریں، یا ایسے نوجوان پیدا کریں جو ڈرائنگ روم کی تہذیب کے چشم و چراغ ہوں یا جو ایٹ ہوم اور ڈنرز کا اچھا انتظام کر سکتے ہوں یا جو ڈپٹی کی قوم کے نام سے ایک نیا طبقہ ہماری سماجی زندگی میں پیدا کریں۔ سرسید کا مقصد اس سے کہیں بلند اور کہیں رفیع تھا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ سرسید کی آخری عمر میں اور شبلی کے دیکھتے دیکھتے جو نسل وجود میں آرہی تھی، اس کی عقل اکبر کے الفاظ میں سرکاری تھی۔ اور اس نے سستی مغربیت کو اپنا شعار بنا رکھا تھا، علی گڈھ نے کوئی علمی فضا سرسید کے بعد پیدا نہیں کی، اس کی وجہ کیا ہے۔ قدیم اسکول، جس کے شبلی نمائندے تھے، علم کے معاملے میں بجید حریص تھا، وہ طلب علم کو ایک مذہبی فریضہ سمجھتا تھا، وہ علم کا احترام کرتا تھا، علم کو محض ایک کاروباری ذریعہ یا زینہ نہیں جانتا تھا، شبلی نے نئی نسل پر جو اعتراضات کئے ہیں، وہ بیشتر حق بجانب ہیں خود حالی بھی سرسید کا ذکر کرتے ہوئے، ایک جگہ لکھتے ہیں "۲۶ برس کے تجربے سے ان کو اس قدر ضرور معلوم ہو گیا ہو گا، کہ انگریزی زبان میں بھی ایسی تعلیم ہو سکتی ہے، جو دیسی زبان کی تعلیم سے بھی زیادہ نکمی، فضول، اور اصلی لیاقت پیدا کرنے سے، قاصر ہو۔" پھر شبلی کی یہ رائے کچھ ایسی غلط نہیں معلوم ہوتی "جدید تعلیم ایک مدت سے جاری ہے اور آج سینکڑوں، ہزاروں تعلیم یافتہ بڑی بڑی خدمات پر مامور ہیں، لیکن قومی علم ابھی ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جنھوں نے کالجوں کے دلوانوں میں نہیں بلکہ مکتب کی چٹائیوں پر تعلیم پائی ہے۔"

یعنی سرسید کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے بھی یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ علمی جدوجہد تصنیف و تالیف ذہنی قیادت، تہذیبی کوششیں، نئی نسل کے مقابلے میں شبلی اور ان کے ساتھیوں کی طرف سے زیادہ ہوئیں۔ سرسید نئی نسل کو ہندوستان کی قیادت سپرد کرنا چاہتے تھے۔ یہ خیال غلط نہ تھا، لیکن انھوں نے نئی نسل کی صحیح تربیت پر توجہ نہ کی اور انھیں سرکاری ملازمت کی طرف ڈھکیل دیا۔ شبلی نئی نسل و انگریزی خواں طبقہ سے مایوس تھے، وہ سمجھتے تھے کہ اگر علمار کو حریت پسند اور روشن خیال بنایا جائے تو قوم کی وہ بہتر قیادت کرسکیں گے۔ خیال برا نہ تھا، لیکن علمار کی تنگ خیالی نے ندوے میں شبلی کو کامیاب نہ ہونے دیا اور ان کے بعض دوست مثلاً صدر یار جنگ ندوے کے نصاب میں معمولی تبدیلیاں اور اصلاحیں گوارا نہ کرتے تھے۔ اور ان کو ایک ایک قدم پر روکتے تھے۔ پرانے رنگ کے علمار شبلی سے ناراض تھے، یہی ہمارے نزدیک شبلی کی روشن خیالی، بیدار مغزی اور دور بینی کی دلیل ہے۔

شبلی کا اثر اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ ہوا۔ حالی نے اردو ادب کی دنیا بدل دی مگر شبلی نے ہندوستان کے مسلمانوں کی ذہنی زندگی پر اثر ڈالا انھیں اپنی چیزوں کی قدر کرنی سکھائی انھیں ہندوستان سے باہر دوسرے اسلامی ممالک کے مسائل کو محسوس کرنے کا عادی بنایا ان میں حقوق کی طلب اور خوشامدانہ سیاست سے بلندی پیدا کی، سید سلیمان، ابوالکلام، عبدالسلام ندوی ظفر علی خاں، مولانا محمد علی، اقبال، سب پر سرسید سے زیادہ شبلی کا اثر ہے۔ اکرام نے یہ غلط نہیں لکھا کہ نئی نسل، سرسید سے زیادہ شبلی سے متاثر ہے، یہ اثر قدرتی تھا۔ سرسید کے جانشینوں نے سرسید سے انقلابی پیغام کو ایک نیم سرکاری ادارے

کی خاکستر میں چھپا دیا تھا، نئے لوگوں نے قدرتی طور پر گرمی ان سے لی، جو اس اثر سے آزاد تھے۔

ہر تحریک اپنے اندر مختلف قسم کے اثرات چھپائے رکھتی ہے، علی گڈھ کی تحریک ایک انقلابی تحریک تھی، یہ ترقی پسند تحریک تھی، یہ بادشاہت کے نشے کو اتار کر، حقیقت کی تصویر دکھانا چاہتی تھی، مذہب میں عقلیت، سماجی زندگی میں رسم ورواج سے بیزاری، تعلیم و تہذیب میں مغربیت اور اجتماعی اخلاق کی تلقین کے ذریعے سے اس نے انقلابی خدمات انجام دیں۔ مگر ۱۸۹۰ء کے قریب اس تحریک کی مغرب دوستی، انگریز پرستی بننے لگی تھی اور اس لحاظ سے یہ ان علماء کے مقابلے میں پیچھے تھی جو دیوبند کے ذریعہ سے حریت پسندی اور سیاسی جد و جہد کے علم بردار تھے۔ اقبال نے لکھا ہے کہ جمال الدین افغانی سر سید سے بڑے آدمی تھے، جمال الدین افغانی نے سر سید کو کس طرح یاد کیا ہے۔ اس کے لئے عروۃ الوثقیٰ کے پرچے یا قاضی عبد الغفار کی آثار جمال الدین افغانی پڑھیے۔ اس سے سر سید کی تحقیر مقصود نہیں لیکن ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ سر سید کے کاموں کو بعض لوگ کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ چنانچہ انیسویں صدی کے اختتام تک علی گڈھ تحریک کی ترقی پسندی پر سیاسی مصلحتوں کے بند باندھے جانے لگے تھے، شبلی انھیں بندشوں سے اکتا کر ایک اور ادارہ بنانا چاہتے تھے، مگر یہ انھوں نے بھی نہ دیکھا کہ دراصل قصور سر سید کے نقطۂ نظر کا نہیں ان کے عمل کا تھا۔ اسے انگریزوں کے ہاتھوں میں دے دینے اور ان کے اشاروں پر چلنے کا تھا۔ ہم نے برسوں انگلستان کے پبلک اسکولوں کی تقلید کر کے ذہن سے زیادہ جسم اور کام سے زیادہ کھیل پر زور دیا، کرکٹ کی ٹیم تیار کر کے انگلستان بھیجی،

مگر محمد علی اور سجاد حیدر کو علی گڑھ میں نہ رہنے دیا، اس طرح ایک اچھی انقلابی تحریک اپنے مقصد میں ناکام ہوگئی اور رجعت پسندی کا شکار بننے لگی۔ شبلی نے اس کی بڑی روک تھام کی اور وہ اس میں بہت کچھ کامیاب ہوئے، ان کی مشرقیت اکبر یا نواب حیدر یار جنگ کی مشرقیت کی طرح مذہب نہیں تھی، وہ ایک نئی مشرقیت کے بانی تھے، وہ یورپ والوں کے علم وفن، تلاش وجستجو، علمی انہماک اور علمی کاموں کے بڑے مداح تھے، وہ یورپ کی روح سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے، مگر وہ یورپ سے مرعوب نہ تھے، انھوں نے اسلامی تاریخ وتہذیب کے کارنامے بیان کرکے مسلمانوں میں محض نشہ نہیں پیدا کیا بلکہ انھیں اس معیار تک پہنچنے کی تلقین کی۔ انھوں نے تحقیق وتنقید کی اچھی اور صالح روایات قائم کیں، انھوں نے اس کے لئے اچھے ادارے بنائے، بعض شاگردوں کو اس کام کے لئے خاص طور پر تیار کیا اور بیسویں صدی کی ذہنی زندگی میں ان سب کا اثر ہم ہر جگہ محسوس کرسکتے ہیں۔ سرسید کی آخری پالیسی پر شبلی کا یہ قطعہ محض دلچسپ نہیں اچھی خاصی حقیقت ہے؎

کوئی پوچھے تو میں کہہ دوں گا ہزاروں میں یہ بات
روشِ سید مرحوم خوشامد تو نہ تھی

ہاں مگر یہ ہے کہ تحریکِ سیاسی کے خلاف
ان کی جو بات تھی آورد تھی آمد تو نہ تھی

غالباً اب یہ واضح ہوگیا ہوگا کہ شبلی کی تحریک سرسید کی ضد نہیں تھی، بلکہ اس کے ایک خاص رجحان کی اصلاح کرکے، اس کی روح کو برقرار رکھنا چاہتی تھی، ہاں یہ دوسری بات ہے کہ علمائے جدید نسل کی قیادت کی امید کرنا عبث

---

[1] سرسید آخر میں بیک کے اشاروں پر چلنے لگے تھے۔

تھا، علماء جدید نسل کے مسائل کو سمجھنے کے لئے نہ پہلے تیار تھے اور نہ آج تیار ہیں، وہ شبلی جیسے اصلاح پسندوں کو گوارا نہیں کرتے تھے، پھر زندگی اور انسانیت کے متعلق نئے سرے سے سوچنے کے لئے کیسے تیار ہوتے، حاشیوں، شرحوں اور نوٹوں پر پلے ہوئے لوگ، اصولی، بنیادی اور اساسی مسائل پر غور و خوض کے لئے راضی کس طرح ہوتے، انھوں نے ایک طرف صوفی کو دنیا سے بے نیاز اور اسی لئے دنیا کے مسائل میں رجعت پسندوں کا شکار بنایا، دوسری طرف ملا کو ابلہ مسجد رکھا جو نئی نسل کو ہمیشہ شبہے کی نظر سے دیکھتا رہا اور اس سے کچھ سیکھنے کے لئے کبھی تیار نہ ہو۔

یعنی شبلی سے علماء نے فائدہ کم اٹھایا، اس نئی نسل نے زیادہ اٹھایا جس سے وہ اس قدر مایوس تھے۔ شبلی کے اثر سے، نئی نسل میں اپنی تہذیبی میراث کا احترام آیا اور سستی مغربیت سے بیزاری، انھیں کے اثر سے مسلمانوں کی سیاست میں ترقی پسند اور حریت پسند عناصر پیدا ہوئے، انھیں کے اثر سے نیا نوجوان ہندوستان میں مسلمانوں کی بادشاہت کو خون کی ہولی سمجھنے کے بجائے، اسے اس کے اصلی رنگ میں دیکھنے لگا، ان کی علمی تصانیف سے اس کے ذہن کو جلا ہوئی، لیکن ان کی نظموں کی چاشنی نے غیر محسوس طور پر اسے کچھ سیاسی اور سماجی قدریں عطا کیں۔ وہ انھیں کے سہارے ترکوں کے دکھ درد میں شریک ہوا۔ اسلام کی ابتدائی سادگی، خلوص اور جوش سے آشنا ہوا اور اپنے زمانے کے ہنگاموں اور معرکوں کو ایک بڑے سانچے اور ادارے کا جزو بنا کر دیکھنے لگا، مسجد کانپور، شہر آشوب اسلام، ڈاکٹر انصاری کی واپسی، جنگِ عظیم، لیگ سے

خطاب، احرار، میں آج بھی وہی تازگی ہی، جو ان کی تصنیف کے وقت تھی۔ سرسید کے جانشین مسلمانوں کو انگریز پرست بنا رہے تھے، شبلی نے اسے روکا، شبلی کے بعد محمد علی ابوالکلام اور اقبال نے نظم و نثر کے ذریعے سے انگریز پرستی کا سد باب کیا اور آج چند ارباب غرض کے سوا، مسلمانوں میں انگریز پرستی عام نہیں ہی۔

شبلی کی تصانیف پر تبصرے کا یہ موقع نہیں ہی، لطیف صاحب نے یہ کام اچھی طرح انجام دیا ہی، لیکن میں چند باتیں شبلی کے تاریخی اور ادبی شعور کے متعلق کہنا چاہتا ہوں۔ شبلی نے سوانح نگاری کے ان اصولوں پر اعتراض کیا تھا، جو حالی نے برتے، حالانکہ شبلی نے جو سوانح عمریاں لکھی ہیں، ان میں قریب قریب وہی اصول مدنظر رکھے گئے ہیں، شبلی حالی سے زیادہ، تحقیق و تلاش، واقعات کی چھان بین، مواد کی ترتیب و تہذیب پر زور دیتے ہیں۔ حالی کے نزدیک شخص اہم ہی نہیں تھا، حیاتِ سعدی، یادگار غالب اور حیاتِ جاوید، تینوں میں زور شخصی حالات پر نہیں، کاموں اور ان کی تفصیل پر ہی، حالی، غالب کی زندگی کے حالات لکھتے وقت، قوم سے معافی مانگنے کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ یادگار میں انھوں نے غالب کی شخصیت کی ایک دل کش اور زندہ تصویر پر اکتفا کی ہی، واقعات کی تفصیل سے گریز کیا ہی، شبلی اس لحاظ سے زیادہ شخص پرست تھے، وہ کارلایل سے زیادہ متاثر تھے اور تاریخ کو مشاہیر کی سوانح عمری سمجھتے تھے، انھوں نے اگرچہ ناموران اسلام کا سلسلہ مکمل نہیں کیا، مگر نہ معلوم کیوں ان کا خیال تھا کہ ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے اعمال نامے سے ہندوستان میں اسلام کا حشر متعین کیا جائے گا۔" اورنگ زیب پر ایک نظر" اس کی اچھی مثال ہی، آخر میں وہ تاریخ کو اسباب و نتائج کا ایک سلسلہ بھی سمجھنے لگے تھے،

لیکن شخص پرستی سے وہ کبھی بھی آزاد نہ ہو سکے۔ شعر العجم میں، جو فارسی شاعری کی تاریخ ہے، انھوں نے مشاہیر کے تذکرے کو سامنے رکھا، اہم رجحانات اور ارتقاء کو نہیں۔ سوانح نگار کی حیثیت سے، وہ حالی سے بلند نہیں کہے جا سکتے، وہ حالی کی طرح غیر جانب دار اور غیر شخصی نہیں ہو سکتے، ہاں حالی سے زیادہ تفصیل پیش کر سکتے ہیں اور زیادہ وسعت پیدا کر سکتے ہیں، وہ بڑے اچھے محقق تھے اور خالص ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے انکا پایہ بہت بلند ہے۔ اگرچہ شیرانی نے ان کی شعر العجم کی بعض غلطیوں پر سخت نکتہ چینی کی ہے اور اگرچہ موازنہ انیس و دبیر، دراصل موازنہ نہیں ہے۔ مگر پھر بھی شبلی کے فیصلے اکثر و بیشتر صحیح اور ان کی تنقیدیں زیادہ تر ایک پاکیزہ اور اچھے ادبی ذوق کی ترجمان ہیں۔ المیزان کی بلی موشگافیاں شبلی کے اس فیصلے کو غلط ثابت نہیں کر سکتیں کہ انیس و دبیر کے یہ دو مصرعے ہی دونوں کا فرق ظاہر کرنے کے لئے کافی ہیں۔

مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں۔ (انیس)

فرمایا میں حسین علیہ السلام ہوں۔ (دبیر)

موازنے کو مہدی نے نصابی چیز کہا ہے، یہ غلط ہے، اس میں مرثیے کی تاریخ ناقص اور سرسری ہے اور دبیر پر تنقید سرسری ہے، لیکن اس کا نقطۂ نظر صحیح، اس کی تنقید اہم، اور اس کا فیصلہ قطعی ہے، انیس کے مطالعے کے لئے اس کی وہی اہمیت ہے، جو غالب کے لئے یادگار کی ہے۔

شبلی کے خطوط میں ان خطوں کو خواہ مخواہ اہمیت حاصل ہو گئی ہے، جو انھوں نے عطیہ فیضی اور زہرہ فیضی کو لکھے تھے، دراصل مکاتیب شبلی ان کی علمی و ادبی زندگی کی بہتر ترجمانی کرتے ہیں۔ شبلی جذباتی آدمی تھے، پھر شاعر تھے،

اچھی پڑھی لکھی خواتین سے متاثر ہوئے، وہ ان کی صحبت سے لطف اٹھاتے اور زندگی میں اچھے کام کرنے کا ولولہ حاصل کرتے تھے۔ ان کی زندگی میں اس سے زیادہ ان خطوں کی اہمیت نہیں ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ "ان کی تصانیف کو بوٗنی لگنی شروع ہوگئی ہے، مگر یہ خط سدا بہار ہیں۔" یہ خط دلچسپ ہیں، اس لئے کہ شاید یہ ایک عالم اور مفکر کے یہاں ہم اس قسم کی چیزوں کی توقع نہیں کرتے تھے، مگر ان کی بہت زیادہ اہمیت نہیں ہے۔ یہ شبلی کی پوری شخصیت کو بے نقاب نہیں کرتے، اس کے صرف ایک گوشے کی مصوری کرتے ہیں۔

شبلی کی نثر کا تو سب لوہا مانتے ہیں، لیکن ان کی شاعری کی طرف پوری طرح توجہ نہیں کی گئی، خوشی کی بات ہے کہ اس کتاب میں اس کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ کہنا تو صحیح نہ ہوگا کہ "لطیف طنزیہ نظمیں لکھنے کا سہرا مولانا شبلی کے سر ہے۔" نہ یہ بات کسی طرح مانی جاسکتی ہے کہ "حالی کی شاعری، شبلی کی شاعری کے مقابلے میں پھیکی اور کم رتبہ ہے۔" اور یہ کہنا بھی خوش فہمی ہے کہ "اگر شبلی اپنی تمام قابلیتوں کے ساتھ اردو شاعری کے لئے وقف ہو جاتے، تو وہ اگر دوسرے فردوسی نہیں تو پہلے اقبال ضرور ثابت ہوتے۔" مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ شبلی کی شاعری، جو ان کی شگفتہ لطیف اور رسا طبیعت کا کبھی کبھی کا ابال ہے، اپنے رس اور شعریت کے ساتھ ساتھ اچھی اور صالح سماجی قدروں کی بھی علمبرداری کرتی ہے۔ شبلی کے یہاں تغزل ہے اور یہ تغزل محض گل وبلبل کی حکایت یا جوانی دیوانی کی داستان کے لئے نہیں، ملک وقوم کے مسائل اور تاریخ کے اوراق کی تشریح کے لئے استعمال ہوا ہے۔ یہ زود ہضم بھی ہے اور صحت بخش بھی۔ اس سے چہرہ بھی روشن

ہوتا ہے اور آنکھوں میں نور بھی آتا ہے، مگر اس کا موازنہ اکبر یا حالی یا اقبال سے صحیح نہیں
کبھی کبھی کی لہر کو مستقل دریاؤں سے نسبت نہیں دیا کرتے۔

شبلی کی زندگی کی کہانی دلچسپ بھی ہے اور عبرت آموز بھی۔ اس کتاب کی اہمیت
اس وجہ سے ہے کہ وہ اپنی پرانی دنیا کو چھوڑ کر ایک نئی دنیا میں پہنچے۔ وہاں وہ خود بھی
بدلے اور اس دنیا کو بھی متاثر کیا۔ جب وہ نئی دنیا ان کے لئے تنگ ہو گئی تو انھوں
نے اپنی پرانی دنیا کی اصلاح میں اپنی عمر صرف کر دی۔ وہ پرانی دنیا تو ان کی اصلاحوں
کو قبول نہ کر سکی، مگر جس دنیا کو وہ چھوڑ کر آئے تھے، وہاں ان کا اثر بڑھا اور
پھیلا اور اس نے نئی نئی شاخیں پیدا کیں اور نئے راستے نکالے۔ وہ باوجود بڑے
پارسا ہونے کے رندی سے چڑتے نہ تھے، ان کی پارسائی میں رندی کی شان ہے۔ شبلی
کی تحریک، سرسید کی تحریک کے خلاف ردِ عمل کی حیثیت نہیں رکھتی، اس کی
ان باتوں کی اصلاح کرتی ہے، ان کا اسلوب پختہ اور عالمانہ ہونے کے باوجود
شگفتہ اور لطیف ہے، افسوس ہے کہ علماء میں شبلی جیسے روشن خیال اور دور بین
اشخاص بہت کم ہوئے ہیں۔ اس سے علماء کو بھی نقصان پہنچا ہے اور ہندوستان
کو بھی اور اب شاید ہمیشہ کے لئے ہندوستان کی ذہنی زندگی کی قیادت ان
سے چھن گئی ہے۔

آلِ احمد سرور

رام پور
۱۸ مئی ۱۹۴۵ء

ادب اور مشرقی تاریخ کا ہو دیکھنا مخزن
تو شبلی سا وحید عصر و یکتائے زمن دیکھو

"مولانا شبلی نعمانی اپنے زمانے کے مشہور ترین اور قابل ترین بزرگوں میں تھے، نہایت کثیر الاشواق اور جامع الاذواق تھے۔ اگر کوئی ایک شخص ایک شاعر، فلسفی، مورخ، ناقد، ماہر تعلیم، معلم، واعظ، ریفارمر، جریدہ نگار، فقیہہ، محدث سب کچھ ہو سکتا ہے، تو وہ مولانا ہی کی ذات تھی کہ انھوں نے ان سب کمالات مختلفہ اور علوم و فنون متنوعہ کا اپنی ذات میں اجتماع کر لیا تھا اور اس کے صحیح مصداق بن گئے تھے ؎

ولیس للہ بمستنکر ان یجمع العالم فی الواحد

مگر ان سب میں ادب، تاریخ اور ریسرچ میں ان کا رتبہ بلند تھا۔ [1]"
شبلی کے متعلق یہ رائے ایک ایسے شخص کی ہے جس پر نہ تو عصبیت کا الزام لگایا

---

[1] تاریخ ادب اردو صفحہ

جا سکتا، داد و تحسین نا شناس کا بلکہ یہ ایک ایسے شخص کی رائے ہے جس نے تاریخ ادب اردو اور اس کے ارتقاء و عروج کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہے اور جس نے ہر دور کے شعراء اور نثر نگاروں پر نہایت اچھی تنقید کی ہے۔ شبلی کی یہی ہمہ گیر اور جامع حیثیت ہے جس نے مجھے ان پر کچھ لکھنے کے لئے آمادہ کیا۔ مجھے اچھی طرح اس کا احساس ہے کہ موجودہ حالات میں ان کی علمی خدمات اور کارناموں کے تمام گوشوں پر روشنی ڈالنا ممکن نہیں، خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ شبلی کے متعلق یکجا مواد ملنا مشکل ہے اور ان کی جولانیٔ طبع کے میدان کی وسعت لامحدود ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس محسن اردو پر کچھ لکھنا کچھ آسان نہیں ہے جس نے بقول مہدی حسن مرحوم "نوخیز بازاری (اردو) یعنی کل کی چھوکری کو جس پر انگلیاں اٹھتی تھیں آج اس لائق کر دیا کہ وہ اپنی بڑی بوڑھیوں اور ثقہ بہنوں یعنی دنیا کی علمی زبانوں سے آنکھیں ملا سکتی ہے" اور جس کا دائرۂ تحقیقات اتنا وسیع ہے کہ وہ یورپ کے مورخین کی صف اول میں جگہ پا سکتا ہے" لیکن یہ احساس کہ ابھی تک چند متفرق مضامین کے علاوہ کچھ زیادہ نہیں لکھا گیا ہے۔ قلم اٹھانے پر مجبور کرتا ہے ظاہر ہے میری یہ کوشش، محض ایک طالب علمانہ کوشش ہو گی ـــــ اس میں خامیاں ہوں گی، نقائص ہوں گے، ممکن ہے کہیں تنقید میں بے راہ روی ہو، دلائل ناکافی اور کمزور ہوں یہ بھی ممکن ہے کہ اس مقالہ کو پڑھنے کے بعد شبلی کی جو تصویر سامنے آئے وہ نامکمل بلکہ ناموزوں ہو، لیکن اس توقع اور امید پر یہ جرأت کر رہا ہوں کہ جو لوگ اس کام کو بہتر طریقہ پر انجام دے سکتے ہیں شاید ان میں اس نامکمل اور بھونڈی تصویر کو دیکھ شبلی کی صحیح اور اصلی تصویر پیش کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔

اردو ادب میں شبلی کا مرتبہ متعین کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اردو ادب و زبان کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تاکہ معلوم ہو سکے کہ شبلی کے میدان تحریر و شاعری میں گامزن ہونے سے قبل اس کی حیثیت کیا تھی اور ان کے معاصرین پر اجمال و اختصار سے بحث کر کے واضح کیا جائے کہ انھوں نے اردو لٹریچر میں کس قدر اضافے کئے اور کس قدر ... نی نے۔

نثر اردو کا آغاز و نشو و نما

اگرچہ اردو کا آغاز آٹھویں صدی ہجری میں شیخ عین الدین گنج العلم متوفی ۷۹۵ھ کی تصانیف سے ہوا۔ بلکہ جدید تحقیقات نے ثابت کیا ہے کہ اس سے قبل بھی باقاعدہ اردو نثر پیدا ہو چکی تھی، لیکن بقول مصنف "تاریخ ادب اردو" در اصل اردو نثر کی ابتدا واقعی فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے ہوئی[۱]۔ دور اول کی کتابیں زیادہ تر مذہبی مباحث پر مشتمل ہیں جن میں سے اکثر فارسی اور عربی کی کتابوں کے ترجمے ہیں۔ چونکہ کارکنان کالج اپنی کتابوں کو عوام میں مقبول بنانا چاہتے تھے اس لئے انھوں نے تصنع و تعقید سے، جو نثر اردو کے ابتدائی دور کی عام خصوصیت ہے، احتراز کیا اور سادگی و بے تکلفی کو زیادہ سے زیادہ راہ دی۔

شمالی ہند میں نثر اردو کی ابتدا بارہویں صدی ہجری میں، مولانا فضلی کی دہ مجلس سے ہوئی۔ اس کے بعد مذہبی اور قصے کہانیوں کی چند اور کتابیں لکھی گئیں، حضرت شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی نے قرآن حکیم کا ترجمہ فرمایا، مگر ان

---

[۱] تاریخ ادب اردو حصہ نثر صفحہ ۱

تمام کتابوں میں ابتدائی دور Primitive کی تمام خصوصیات نمایاں ہیں اور ان میں کوئی خاص بات نہیں رہی، دکنی تصانیف کے مقابلے میں سادگی اور بے لطفی نسبتاً کم ہے، بعض کتابوں میں قوافی کا بھی التزام کیا گیا ہے، لیکن دکنی نثر کی تھوڑی بہت ترقی کے باوجود ان دونوں جگہوں پر اب تک جو کچھ لکھا گیا تھا وہ ایسا نہ تھا جو کسی زبان کو دنیا کی تہذیب یافتہ اور شائستہ زبانوں کی ہمسر بنا سکے"[1]

سنہ ۱۸۰۰ء میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا، گو اس کی تاسیس کے وقت انگریزوں کا اپنا مخصوص مفاد پیش نظر تھا، لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس سے اردو ادب و زبان کو بڑا فائدہ پہونچا۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ انیسویں صدی کے شروع میں اس کے منتظم اعلیٰ مقرر ہوئے۔ موصوف نے دلی اور لکھنؤ کے مشہور ادیبوں اور شاعروں کو جمع کیا اور اردو زبان کو اتنی ترقی دی کہ سنہ ۱۸۳۲ء میں فارسی کی جگہ یہ سرکاری اور درباری زبان قرار پائی اور سنہ ۱۸۳۵ء میں ایک آدھ اخبارات نکلنے شروع ہوئے جن سے اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں بہت مدد ملی۔

فورٹ ولیم کالج میں جن لوگوں نے اردو نثر کے فروغ و ترقی میں ممتاز حصہ لیا، ان میں میر امن اور حیدر بخش حیدری سر فہرست ہیں۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے با محاورہ، سادی اور سلیس عبارت لکھنے کی طرح ڈالی۔ ان کی کتابیں دیکھنے سے یقین نہیں آتا کہ یہ انیسویں صدی عیسوی کے

---

[1] اسالیب اردو صفحہ ۱۵

اوائل کی لکھی ہوئی ہیں اگر کہیں کہیں قدامت کی جھلک نہ ہو تو مولوی نذیر احمد صاحب کی زبان کا، جو اس کے ایک صدی بعد لکھی گئی، دھوکہ ہوگا۔

اسی زمانے میں وہابی تحریک شروع ہوئی اس سے مذہبی مناظرے اور مباحثے کے دروازے کھل گئے، مدافعت اور مخالفت میں متعدد کتابیں اور رسالے لکھے گئے۔ چونکہ ان کے مخاطب تمام تر عوام اور زیادہ تر ان پڑھ تھے اس لئے اس سلسلہ میں نہایت سادہ زبان لکھنے کی کوشش کی گئی لیکن پھر بھی ایک عرصہ تک مقفیٰ اور مسجع عبارتیں لکھنا باعث فخر سمجھا جاتا رہا، حتیٰ کہ ۱۸۴۷ء میں جب سرسید کی مشہور کتاب آثار الصنادید شائع ہوئی، تو اس میں بھی قوافی کی پوری پوری رعایت کی گئی۔ یہ اس شخص کی کتاب کا حال تھا جو بعد میں سادہ اور بے تکلف نثر نویسی کا امام ہوا

دلی کی تباہی اور بربادی کے بعد لکھنؤ علوم و فنون کا مرکز قرار پایا یہاں بھی نثر میں متعدد کتابیں لکھی گئیں، دبستانِ حکمت، کلیلہ و دمنہ، گل بکاؤلی، گلشن نوبہار، گل صنوبر اور نورتن اسی زمانے کی یادگار ہیں، لیکن لکھنؤ، فورٹ ولیم کالج کی تحریکِ سادہ نگاری سے بہت بعد میں متاثر ہوا، اس لئے ان کتابوں میں قدیم اسلوب بہت نمایاں ہے۔

اُردو کی ترقی میں سرسیّد کا حصہ

۱۸۵۷ء میں سانحۂ غدر پیش آیا۔ زوالِ حکومت سے مسلمانوں کی حالت یونہی خراب و خستہ ہو چکی تھی، اس حادثہ نے ان کے تمام شعبہائے حیات میں

افسردگی اور اضمحلال پیدا کر دیا۔ یاس و قنوط نے طبیعتوں کو مردہ کر دیا، یاسیت و نا امیدی نے کمر ہمت توڑ دی۔ کتاب زندگی کا ایک ایک ورق منتشر ہو گیا اور صدیوں کا مجتمع شیرازہ ایک ایک کر کے بکھر گیا، اس وقت ضرورت تھی ایک مسیحا کی جو ان ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑ دے، ضرورت تھی ایک رہبر کی جو اس مردہ اور مایوس قوم کی ہمت بڑھائے، ضرورت تھی ایک قائد کی جو ملت کی رہنمائی کر سکے۔

قوم کو کچھ زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا سرسید میدان عمل میں آئے اور مسلمانوں کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ انھوں نے جہاں مسلمانوں کی اور بہت سی خدمتیں انجام دیں وہاں اردو کو بھی بہت فروغ دیا۔ "وہ ایک قومی بنا اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے بانی ہی نہیں تھے، بلکہ اردو زبان کے ایک بڑے ادیب اور صاحب قلم تھے، ان کے زور قلم اور ادبی خدمات نے درحقیقت اردو ادب میں ایک نیا دور شروع کیا۔

سرسید سے قبل اردو زبان علوم و فنون سے نا آشنا تھی۔ اچھی کتابیں اگر کچھ تھیں تو بہت کم، جیسے آٹے میں نمک۔ طرز تحریر نہایت الجھا ہوا اور تعقید و تصنع سے پُر۔ فورٹ ولیم کالج کے ترجموں اور تالیفوں میں سادگی اور سلاست کی یقیناً کوشش کی گئی، لیکن اگر سرسید ادھر توجہ نہ کرتے تو شاید منزل مقصود تک پہنچنے میں بہت دیر لگتی سرسید کا اردو زبان و ادب پر یہ بہت بڑا احسان ہے کہ انھوں نے نوجوان لکھنے والوں میں ادبی تنقید کا ذوق پیدا کیا اور اردو لٹریچر کو صحیح ادبی رنگ سے آشنا کیا، جو ان سے

قبل ناپید تھا، مغربی خیالات کے قبول کرنے میں مسلمانوں کو سخت تامل تھا اور اگر سرسید نہ ہوتے تو جدید خیالات واسالیب کو اخذ کرنے میں خدا جانے کب تک انتظار کرنا پڑتا، لیکن سرسید نے اپنی مستقل مزاجی اور موثر شخصیت کی بنا پر اردو ادب میں انقلاب پیدا کیا اور بقول ڈاکٹر عبداللطیف "عہد جدید کی تاریخ میں اور کوئی ملک اس طرح یکایک حیات بخش خیالات اور تصورات کے نور سے منور نہیں ہوا۔ اس کی اگر کوئی مثال ملتی ہے وہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ ہے"[1] سرسید نے نہایت خلوص اور سچائی کے ساتھ معاشرتی خرابیوں پر تبصرہ کر کے عزت و وقار اور اعلیٰ تنقید کے عناصر سے اردو ادب کو آشنا کیا۔ سرسید کا طرز تحریر بہت موثر Vigorous style تھا، سادگی، خلوص اور عدم تصنع اس کی خصوصیات تھیں، Joseph Conrad نے خود اپنے متعلق کہا تھا کہ "کل اہل ادب میں ادبیت سے سب سے زیادہ دور"[2] وہ سرسید پر بالکل صادق آتا ہے۔ مولانا شبلی نے ان کے متعلق کسقدر صحیح لکھا ہے۔

> سرسید کی بدولت اردو اس قابل ہوئی کہ عشق و عاشقی کے دائرہ سے نکل کر ملکی، سیاسی، اخلاقی، تاریخی ہر قسم کے مضامین اس زور و اثر، وسعت و جامعیت، سادگی اور صفائی سے ادا کر سکتی ہے کہ خود اس کے استاد یعنی فارسی زبان کو آج تک یہ بات نصیب نہیں ہوئی ملک میں آج بڑے بڑے انشاپرداز موجود ہیں، جو اپنے اپنے مخصوص

---

[1] The influence of English literature on Urdu literature P. 90 [2] The most unliterary of all the literary men

دائرہ مضمون کے حکمراں ہیں، لیکن ان میں سے ایک شخص بھی نہیں جو سرسید کے بار احسان سے گردن اٹھا سکتا ہو۔ بعض بالکل ان کے دامن تربیت میں پلے ہیں بعضوں نے دور سے فیض اٹھایا ہے۔ بعضوں نے مدعیانہ اپنا الگ رستہ نکالا، تاہم سرسید کی فیض پذیری سے بالکل آزاد کیوں کر رہ سکتے تھے۔

سرسید کی انشاء پردازی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ہر قسم کے مختلف مضامین پر کچھ نہ کچھ بلکہ بہت کچھ لکھا ہے اور جس مضمون کو لکھا ہے اس درجہ پر پہنچا دیا ہے کہ اس سے بڑھ کرنا ممکن ہے۔ فارسی اور اردو میں بڑے بڑے شعرا اور نثار گذرے ہیں لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو ہر قسم کے مضامین کا حق ادا کر سکتا ہو۔ فردوسی بزم میں رہ جاتا ہے، سعدی رزم کے مرد میداں نہیں ہیں، نظامی رزم و بزم دونوں کے استاد ہیں لیکن اخلاق کے کوچہ سے آشنا نہیں ظہوری صرف مدحیہ نثر لکھ سکتا ہے، برخلاف اس کے سرسید نے اخلاق، معاشرت، پالیٹکس، مناظر قدرت وغیرہ وغیرہ سب پر لکھا ہے اور جو کچھ لکھا ہے خوب لکھا ہے۔

سرسید کی انشاء پردازی کا بڑا کمال اس موقع پر معلوم ہوتا ہے جب وہ کسی علمی مسئلہ پر بحث کرتے ہیں۔ اردو زبان چونکہ کبھی علمی زبان کی حیثیت سے کام میں نہیں لائی گئی اس میں علمی اصطلاحات، علمی الفاظ اور علمی تلمیحات بہت کم ہیں اس لئے اگر کسی علمی مسئلہ کو اردو میں

لکھنا چاہیے، تو الفاظ مساعدت نہیں کرتے، لیکن سرسید نے مشکل سے مشکل مسائل کو اس وضاحت اور دلآویزی سے ادا کیا ہو کہ پڑھنے والا جانتا ہے کہ کوئی دلچسپ قصہ پڑھ رہا ہے۔

سرسید نے الٰہیات پر جو کچھ اپنی مختلف تحریروں میں لکھا ہو وہ فلسفہ کے اعلیٰ درجہ کے مسائل ہیں[1]

طرزِ تحریر کی دلکشی سے زیادہ، سرسید کی شخصیت میں دلکشی اور جاذبیت تھی وہ چوسر[2] کی طرح تہذیب کی دونوں اقلیموں کے تاجدار تھے۔ کتابوں کی دنیا کے بھی اور انسانوں کی دنیا کے بھی۔ چنانچہ اردو کے ادیب صرف سرسید کے طرزِ تحریر ہی سے متاثر نہیں ہوئے، بلکہ ان کی شخصیت اور عظمت کا بھی انھوں نے بہت زیادہ اثر قبول کیا۔ سرسید اگر اس صدی کے سب سے بڑے نہیں تو عظیم ترین لوگوں میں سے ضرور تھے اور یقیناً وہ نہ صرف گلشنِ ادب اُردو میں نہایت نادر اور سرسبز و شاداب درخت تھے، بلکہ اسلامی ہند کے چمنستان میں ان سے طویل اور شاندار درخت کوئی نہیں تھا۔

سرسید سے قبل فورٹ ولیم کالج اور بعض انفرادی کوششوں کی بدولت مغربی زبانوں سے کچھ کتابیں ضرور اردو میں منتقل کی گئیں، لیکن ان کی تعداد بہت کم تھی اور علمی و فنّی کتابیں تو تقریباً نہ ہونے کے برابر تھیں اس لئے سرسید نے سنہ ۱۸۶۲ء میں غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی کے نام سے ایک ادارہ کا سنگِ بنیاد رکھا تاکہ اس کے ذریعہ سے انگریزی کی مشہور اور مستند کتابیں اردو میں

---

[1] محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین۔ علی گڑھ مئی ۱۸۹۸ء
[2] Chaucer

ترجمہ کی جاسکیں اور یہ واقعہ ہے کہ اس سوسائٹی نے اردو میں ترجمہ کی خدمت بڑی حد تک انجام دی۔

۱۸۶۴ء میں جب سرسید کا تبادلہ علی گڑھ ہوا تو یہ سوسائٹی بھی وہیں منتقل ہوگئی اور یہاں سے تقریباً دو سال کے بعد یعنی اس کے ایک ماہوار آرگن علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا اجرا عمل میں آیا جو Peoples of the Indian Empire کے مصنف کے الفاظ میں "شمالی ہند میں سب سے عمدہ اخبار تھا اور جس نے بلا شبہہ اس وقت کے مسلمانوں کے ذہنی انقلاب میں ایک نمایاں اور ممتاز حصہ لیا" گو "اس کا خاص مقصد گورنمنٹ اور انگریزوں کو ہندوستانیوں کے حالات اور معاملات اور خیالات سے آگاہ کرنا اور ہندوستانیوں کو انگریزی طرز حکومت سے آشنا کرنا اور ان میں سیاسی مذاق اور پولیٹکل خیالات کو رواج دینا تھا، اسکی ابتدائی جلدوں کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ انگریزی خیالات کو ہندوستانی لباس میں اور ہندوستانی خیالات کو انگریزی لباس میں ظاہر کرکے، دونوں قوموں کو ملانا چاہتے ہیں" تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو ادب و زبان کی ترقی و اصلاح میں اس کا بہت بڑا حصہ ہے۔

"۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سربرآوردہ ہندوؤں نے اردو زبان اور فارسی رسم الخط کو تمام سرکاری عدالتوں سے نکالنے اور اس کے بجائے بھاشا زبان کو جو دیوناگری میں لکھی جائے، جاری کرانے کی کوشش کی" اس وقت سرسید ہی کی ایک ذات تھی جس نے اس تحریک کی شدید مخالفت کی اور اردو کو اس عظیم الشان طوفان سے بچایا۔ اردو زبان پر سرسید کا یہی احسان اتنا بڑا ہے

جس سے کبھی سبکدوش نہیں ہوا جا سکتا۔

دسمبر ۱۸۷۰ء میں سرسید نے تہذیب الاخلاق جاری کیا، جس کا اردو زبان و ادب کے انقلاب میں نہایت ممتاز اور نمایاں حصہ ہے اور قدیم اسلوب تحریر اور طرز نگارش کی اصلاح و تبدیلی میں اس کا بہت زیادہ ہاتھ ہے، اس نے فارسی نما اردو کے بجائے سہل اور سیدھی سادی زبان کی بنا ڈالی، اردو انشار پردازی اور طرز نگارش کے ایک نئے دور اور ایک جدید عہد کا آغاز کیا اور بقول ایک انگریز کے "تہذیب الاخلاق نے یہ ثابت کر دیا کہ اردو میں بھی ہر قسم کے مضامین اور خیالات عمدگی اور سادگی سے ادا ہو سکتے ہیں[1]"، خود سرسید تہذیب الاخلاق میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"جہاں تک ہم سے ہو سکا، ہم نے اردو زبان کی علم ادب کی ترقی میں، اپنے ناچیز پرچوں کے ذریعے سے کوشش کی (۱) مضمون کے ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا (۲)، رنگین عبارت سے جو تشبیہات اور استعارات خیالی سے بھری ہوتی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا، پرہیز کیا (۳)، اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو مضمون کے ادا میں ہو (۴)، جو اپنے دل میں ہو، وہی دوسرے کے دل میں پڑے، تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے"

سرسید کو اپنے مقصد میں کہاں تک کامیابی ہوئی، اس کا صحیح اندازہ اس

---

[1] تہذیب الاخلاق جلد ۴ نمبر ۱

وقت ہوگا، جبکہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق کی زبان اور ان کے معاصر اخبارات و رسائل کی زبان سے مقابلہ کیا جائے۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۸۶۶ء میں جاری ہوا تھا۔ اس سے ایک سال پہلے یعنی ۱۸۶۵ء میں ہندوؤں کا ایک پرچہ "گیان پتریکا" جاری ہوا تھا جس کے اغراض و مقاصد کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی تھی:-

"اس میں اشلوک ہائے اصل صحائف قدیم، سنسکرت معہ ترجمان بزبان شاستر ہائے معرفت و حقائق و علمی و عملی پند و وعظ مفید خلائق و انواع حکمات ہر گونہ کار آمد و احوال دورہ زماں خصوصاً دامن حقیقت و اصل مراد و نیز تنقید کلام درج ہوتے ہیں"

یہ تو اس اخبار کی زبان ہے جو سر سید کے اخبار سے ایک سال پہلے جاری ہوا تھا اور ہندوؤں کا مذہبی پرچہ تھا، لیکن اسی سال، جس سال علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جاری ہوا تھا، دلی سے ایک اردو اخبار نکلنا شروع ہوا تھا، اس کی زبان بھی ملاحظہ ہو۔ ذوق کی وفات کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:-

خبر دردناک رحلت الملک الشعراء خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق استاد خاص حضور والا نے ۲۳ صفر شب آخر چہار شنبہ ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۱ نومبر ۱۸۵۴ء عالم فانی سے بسوئے عالم جاودانی رحلت کی، الحق یہ مصیبت عظیم ہے کہ اگر صاحب زباں محاورہ فرس و ریختہ و اردو بلکہ تمام اہل سخن ہند لباس ماتمی پہن لیں تو روا ہے۔ حضور والا کو جب اطلاع اس واقعہ جانکاہ کی ہوئی۔ باوجودیکہ دربار عام

بتقریب آخری چہار شنبہ مہیا تھا اور سب اراکین سلطنت باریابی
مجرے کو حاضر لیکن سب کو برخواست کر دیا اور حکم دیا کہ شاہزادگان
والا تبار مع جمیع اہل دربار استاد مرحوم کی مشایعت جنازہ میں
شریک ہوں "

اس کے بعد اب ذرا علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق کی زبان ملاحظہ ہو کہ کس قدر صاف سادہ اور سہل ہے۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی پہلی ———
جلدیں انتہائی کوشش کے باوجود نہ مل سکیں اتفاق سے دلی کے کسی کتب خانہ میں اس کا کوئی فائل محفوظ نہیں، حتیٰ کہ انجمن ترقی اردو کا کتب خانہ بھی اس سے محروم ہے، لکھنؤ اور بعض دوسرے مقامات پر بھی حاصل کرنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہو سکی، مسلم یونیورسٹی میں تیسری جلد مل سکی، ذیل کی عبارت اسی سے ماخوذ ہے۔

دیسی زبانوں کی ترقی کے واسطے جو طریقے میرے ذہن میں
آئے ہیں۔ وہ مندرجہ ذیل ہیں:۔

اول۔ اعلیٰ درجہ کی تعلیم کے لئے کتابوں کا تیار ہونا۔

دوم۔ ان کتابوں کے پڑھانے کا طریقہ مقرر ہونا۔

سوم۔ جو طالب علم دیسی زبان میں کامل دستگاہ پیدا کریں اور اپنے
امتحان میں پورے اتریں ان کی نوکری کے واسطے کوئی صورت
نکالنا۔

چہارم۔ ان سب تجویزوں کو جاری ہونے کے لئے روپیہ وافی بہم پہونچانا۔

پہلی تجویز کے انجام ہونے کے لئے یہ تدبیر کرنی چاہیئے کہ جہاں

یونیورسٹی اور بڑے بڑے مدرسے قائم ہوں وہاں کچھ لوگ اس غرض سے نوکر رکھے جائیں کہ وہ عمدہ اور مفید کتابوں کا ترجمہ کریں، ایسی کتابیں خود تصنیف کریں اور چند عالموں کی کمیٹی کے مشورے اور ہدایت کے موافق، جن کو گورنمنٹ نے نگرانی کے واسطے مقرر کیا ہی کار بند ہوں علاوہ اس کے ان خاص خاص شخصوں اور سوسائٹیوں کو، جو اس معاملہ میں ممد و معاون ہیں، ترغیب دی جائے، کہ کمیٹی مذکور بالا ان کتابوں اور تحریروں پر غور کامل کر کے ان کو پسند کرے .... ڈائرکٹر ممدوح کو کچھ اس بات سے غرض نہیں کہ ایسی کتابیں، جن کے پڑھنے سے عقل کو تیزی اور فہم و ذکا کو فروغ ہو، اور حقیقت میں مفید اور کار آمد باتیں حاصل ہوں شائع کی جادیں۔ علاوہ اس کے ایک یہ ابتری ہی کہ جن کتابوں کو صاحب ڈائرکٹر منظور فرماتے ہیں ان کو قاعدہ کے موافق کوئی نہیں دیکھتا بھالتا[1]۔"

یہی سادہ زبان تہذیب الاخلاق میں ترقی کر کے بہترین ادبی زبان بن جاتی ہی۔ ملاحظہ ہو:۔

"دیکھو نادان، بے بس بچہ گہوارہ میں سوتا ہے، اسکی مصیبت زدہ ماں اپنے دھندے میں لگی ہوئی ہی اور اس گہوارہ کی ڈوری بھی ہلاتی جاتی ہے۔ ہاتھ کام میں اور دل بچہ میں، ہی اور زبان پر

---

[1] جلد ۳ نمبر ۱ صفحہ ۱۱

اس کو یوں لوری دیتی ہے۔ سورہ میرے بچے سورہ، اپنے باپ کی مورت اور میرے دل کی ٹھنڈک سورہ، اے میرے دل کی کونپل سوہ، بڑھ اور پھل پھول، تجھپر کبھی خزاں نہ آئے، میری ٹہنی میں کبھی کوئی خار نہ پھوٹے، کوئی کٹھن گھڑی تجھکو نہ آئے، سورہ میرے بچے سورہ، میری آنکھوں کے نور اور میرے دل کے سرور میرے بچے سورہ، تیرا مکھڑا چاند سے بھی زیادہ روشن ہوگا تیری فضیلت تیرے باپ سے بھی اچھی ہوگی، تیری شہرت، تیری لیاقت، تیری محبت، جو تو ہم سے کرے گا، ہمارے دل کو تسلی دیں گی، سورہ میرے بچے سورہ، سورہ میرے بچے سورہ"[1]

آپ نے بہت سی لوریاں سنی ہوں گی، نظم میں بھی اور نثر میں بھی، لیکن کیا اس سے اچھی بھی کبھی سننے میں یا پڑھنے میں آئی؟ کیا کسی ماں کے جذبات اور خواہشات کی ایسی تصویر کشی اور اتنی سادہ مگر پر جوش اور شیریں زبان کہیں اور دیکھنے میں آئی؟ ایک ٹکڑا اور ملاحظہ ہو۔ یہ تحریر تہذیب الاخلاق کو بند کرتے وقت لکھی گئی ہے اس لئے اس میں لکھنے والے کے جذبات بھی شامل ہیں اور پوری طرح نمایاں ہیں۔

"سوتوں کو جھنجھوڑتے ہیں کہ جاگ اٹھیں، اگر اٹھ کھڑے ہوئے تو مطلب پورا ہوگیا اور اگر نیند میں اٹھانے سے کچھ بڑبڑائے، کچھ جھنجھلائے، ادھر ہاتھ جھٹک دیا، ادھر پیر جھٹک دیا اور اینڈے پڑے سوتے رہے، تو بھی توقع ہوئی کہ تھوڑی دیر بعد جاگ اٹھیں گے

---

[1] تہذیب الاخلاق جلد ۴ نمبر ا

شاید ہمارے بھائیوں کی اس اخیر درجہ تک نوبت آگئی ہو۔ اگر یہ خیال ٹھیک ہو تو ہم کو بھی زیادہ نہ چھیڑنا چاہیئے، بچے اٹھاتے وقت کہہ اٹھتے ہیں کہ ہم کو اٹھائے جاؤ گے، تو ہم اور بڑے رہیں گے، تم ٹھہر جاؤ، ہم آپ ہی اٹھ کھڑے ہوں گے، بچہ کڑوی دوا پیتے وقت بسور کر ماں سے کہتا ہو کہ بی! یہ مت کہے جاؤ کہ شاباش بیٹا پی لے، تم چپ رہو، ہم آپ ہی پی لیں گے، تو بھائیو! اب ہم بھی نہیں کہتے کہ اٹھو اٹھو، پی لو، پی لو۔[1]

سرسید کے متعلق "خطوط سرسید" کے مرتب نے لکھا ہو کہ "ان کے الفاظ میں انتہا درجے کی فصاحت اور مضمون میں بدرجہ اتم بلاغت ہوتی تھی، مگر انھوں نے نمائشی لفاظی اور دور از کار انشاء پردازی اور عبارت پیچیدہ کی رنگینی کو کبھی پاس نہیں آنے دیا۔"[2] اوپر کے دونوں ٹکڑے اس کی بہترین مثال ہیں۔

تہذیب الاخلاق نے صرف اردو نثر کے اسلوب اور طرز نگارش ہی میں انقلاب پیدا نہیں کیا، بلکہ اردو شاعری کی ترقی و اصلاح بھی بہت حد تک اسکی ممنون احسان ہو۔ اردو شاعری جس میں دو سو برس سے ایک ہی قسم کے خیالات برابر دہرائے جا رہے تھے، اس نے بھی زیادہ تر اسی رسالہ کی تحریک سے کروٹ بدلی، نئے نئے میدانوں میں شعراء قدم رکھنے لگے اور مبالغہ اور جھوٹ کی جگہ حقائق و واقعات کے خاکے کھینچنے لگے اور شاعری بجائے اس کے کہ محض ایک دل لگی کی چیز سمجھی جاتی، ایک کام کی چیز بن گئی۔[3]

---

[1] تہذیب الاخلاق جلد ۲ نمبر ۱ مقدمہ صفحہ ۱۹ [2] ... [3] حیات جاوید حصہ دوم صفحہ ۲۲۳ دوسرا ایڈیشن

سرسید متعدد کتابوں کے مصنف بھی ہیں، جو بیشتر مذہبی مباحث پر مشتمل ہیں اور جیسا کہ ہم اوپر عرض کر چکے ہیں، ان کا اردو زبان و ادب کو ترقی دینے اور اس کو ایک مخصوص نہج پر لگانے میں بہت بڑا حصہ ہے۔ لیکن سرسید کا ان سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے صاحب فکر اہل قلم کی ایک منتخب جماعت اپنے گرد جمع کر لی تھی اور ان میں بھی اپنا ہی جیسا جوش و خروش پیدا کر دیا تھا۔ اس سے زبان و ادب کو اتنا فائدہ پہنچا کہ اگر خود ادب اور تنقید کی سینکڑوں کتابوں کے مصنف ہوتے تو بھی اتنا فائدہ شاید نہ پہنچا سکتے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سرسید نے اس جماعت کے ذریعے اردو کو حیات جاوید بخشی۔ اس جماعت کے نمایاں اور ممتاز افراد نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، مولوی چراغ علی، مولوی ذکاءُاللہ، خواجہ الطاف حسین حالی، مولانا شبلی نعمانی مولانا نذیر احمد، اور مولوی زین العابدین ہیں۔ مگر ان میں سے خصوصیت کے ساتھ تین نے بڑی شہرت حاصل کی اور ان کے ساتھ شمس العلما محمد حسین آزاد کو شامل کر لیا جائے تو ایک چوکڑی بن جاتی ہے۔ جنھیں اردو کے عناصر اربعہ کہا جاتا ہے۔

پروفیسر آزاد ۱۸۲۹ - ۱۹۱۰

شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد کو عناصر اربعہ میں اولیت کا شرف حاصل ہے اور مولانا شبلیؒ کے الفاظ میں انھیں "خدائے اردو" کہنا بالکل صحیح ہے۔ اگرچہ آزاد کا اسلوب اور طرز نگارش رواج نہ پا سکا، لیکن اس سے

ان کے کمال پر کوئی حرف نہیں آتا۔

آزاد نے جس زمانہ اور جس ماحول میں یہ اسلوب اختیار کیا اس کے لئے ہر طرح مناسب تھا، اس وقت تک لوگ مقفیٰ اور مسجع تحریر کے عادی تھے، باوجود اس کے آزاد نے قافیہ اور سجع سے احتراز کیا۔ لیکن یہ کہنا غالباً بے جا نہ ہوگا کہ ان کا طرز تحریر، رنگینی، لفاظی اور مبالغوں کے زور میں ابتدائی زبان سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

آزاد کی علمی خدمات کی ابتدا لاہور میں فارسی کی درسی کتابوں سے شروع ہوئی، موصوف کی ان ریڈروں سے صوبہ پنجاب میں اردو کی ترویج و اشاعت میں بڑی مدد ملی۔ لیکن ان کی بہترین تصنیف جس کی بنا پر آزاد، آزاد کہلائے آبحیات ہے۔ آزاد نے یہ کتاب لکھ کر اردو زبان و ادب پر اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ اس بارے اردو کبھی بھی سبکدوش نہیں ہوسکتی گو جدید تحقیقات اور ادب کی ترقی نے اس میں بہت سی غلطیاں اور نقائص نمایاں کردی ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس سے تنقید نگاری کی بنیاد پڑی، یادگار غالب جیسی تصنیف کا باعث ہوئی[1] اور ایک عرصہ تک ماٰخذ کا کام دیتی رہی۔

دربار اکبری، سخندان فارس اور نیرنگ خیال بھی ان کی مشہور تصانیف ہیں۔ اوّالذکر، اکبری دربار کی ایک مبسوط تاریخ ہے۔ مبسوط اس

---

[1] تاریخ ادب اردو حصہ نثر صفحہ ۵۰

معنی میں کہ چھوٹے بڑے تمام واقعات کا استقصا کیا گیا ہے، ورنہ نہایت اہم اہم امور کو، جن سے اس عہد کی کوئی تاریخ مستغنی نہیں ہو سکی ہاتھ تک نہیں لگایا گیا ہے۔ مثلاً اکبر کی حکمت عملی، اکبر کا دین الٰہی اور اس کے دور رس نتائج، اکبر کے عہد میں زرعی اور اقتصادی اصلاحات وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ تاریخ جس زبان اور جس اسلوب کی مقتضی ہے، وہ آزاد کے یہاں مفقود ہے، ان کی انشاء پردازی آبحیات اور نیرنگ خیال جیسی تصانیف کے لئے تو موزوں ہو سکتی ہے، لیکن ایک تاریخی کتاب کے لئے کسی طرح مناسب نہیں ہو سکتی مثلاً ایک جگہ جنگ کی تیاری کے متعلق لکھتے ہیں۔

"خلوت کے چمن میں حکم ہوا کہ مشورت کی بلبلیں آئیں کہ ہنگامہ کے لئے کیا صلاح ہو بعض کا زمزمہ ہوا کہ برسات میں ملک مقبوضہ کا بندوبست ہو، جاڑے کی آمد میں ہنگامہ خونریزی سے گلزار کا خاکہ ڈالا جائے، بعض نے نغمہ سرائی کی کہ غنیم کو دم نہ لینے دو، اڑ جائیں اور چھری کٹاری ہو جائے کہ یہی بہار ہے۔ فتح کے گلچیں اور سلطنت کے باغبان نے کہا کہ یہی ہانک سچ ہے۔"

سخندان فارس کا موضوع لسانیات ہے، اس میں فارسی اور سنسکرت کو متحد الاصل ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مصنف کے سفر ایران کے حالات بھی درج ہیں، لیکن بقول مصنف تاریخ ادب اردو

"مثل مولانا شبلیؒ کی شعر العجم کے یہ ایک مکمل کتاب نہیں کہی جا سکتی"۔

آخر الذکر کتاب کی، زبان کے لحاظ سے بڑی دھوم ہے، لیکن امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ اس کی رہی سہی اہمیت بھی تقریباً ختم ہو جائے گی۔ افسانوں کے جدید طرز نے، قدیم قصے کہانی کی کتابوں کو ٹکسال باہر کر دیا ہے، زبان کی خاطر ممکن ہے، بعض لوگ اسے پڑھتے ہوں، مگر بدلتے ہوئے ذوق و رجحان کے پیش نظر یہ جاذبیت بھی کچھ دیر پا ثابت نہ ہوگی۔ ان کے علاوہ مولانا کی حسب ذیل کتابیں ہیں،

نگارستان فارسی، قند پارسی، آموز گار پارسی، تذکرۂ علماء، کائنات عرب، سپاک نماک، فلسفۂ الٰہیات، ڈرامہ اکبر، نصیحت کا کرن پھول، جانورستان، سیر ایران۔ اور قصص ہند حصہ دوم۔

اپنے استاد حضرت ذوق کا دیوان بھی آزاد نے مرتب کیا ہے جس کے شروع میں ایک مختصر سا دیباچہ بھی ہے۔ مکتوبات آزاد اور نظم آزاد بھی مولانا کی قلمی یادگاریں ہیں۔ ان میں سے بعض کتابیں بہت ہی معمولی ہیں اور ان کی حیثیت ایک مضمون سے زیادہ نہیں۔

لیکن ان سب کے باوجود یہ واقعہ ہے کہ آزاد نے اردو نثر کے دامن کو، جس میں قصے و حکایات کے سوا کچھ نہ تھا تاریخ و ادب کے جواہر ریزوں سے بھر دیا اور سچ پوچھئے تو اردو لٹریچر کا سنگ بنیاد انھی نے رکھا اور اس حیثیت سے انھیں ادب اردو کا بانی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ موصوف کے طرز نگارش کو سمجھنے کے لئے ذیل کی عبارت

ملاحظہ ہو۔

"زبان اردو کے پاس جو کچھ سرمایہ ہے، وہ شعرائے ہند کی کمائی ہے، جنھوں نے فارسی کی بدولت اپنی دوکان سجائی ہے، اس کی سرزمین کی ہوا بگڑی ہوئی ہے، جو کچھ ہے وہ اتنا ہی ہے کہ فارسی کے پروں سے اڑی، الفاظی اور مبالغوں کے زور سے آسمان چڑھ گئی، وہاں سے جو گری تو استعاروں کی تہ میں ڈوب کر غائب ہوگئی۔ اس کی طبع آزمائی کا زور اب تک فقط چند مطلب میں محصور ہے مضمون عاشقانہ گلگشت مستانہ، نصیبوں کا رونا، امید موہوم پر خوش ہونا، امرا کی ثنا خوانی جس پر خفا ہوئے اس کی خاک اڑائی۔ البتہ رنگوں میں اس نے لطافت اور نازک خیالی کو کہاں تک پہنچایا کہ حد سے گزار دیا .... فارسی میں صدہا نظم و نثر کی کتابیں ہیں، جن کے خیالات باریکی اور تاریکی عبارت میں جگنو اڑتے نظر آتے ہیں لیکن کیا حاصل! اس انداز میں اصل ماجرا ادا کرنا چاہو تو ممکن نہیں، ایسی ماں کا دودھ پی کر اردو نے پرورش پائی تو اس کا کیا حال ہوگا۔"

مولانا نذیر احمد ۱۸۳۱-۱۹۱۲

جس طرح پروفیسر آزاد کی تصنیف و تالیف کا آغاز کورس کی

ریڈروں سے ہوا، اسی طرح مولانا نذیر احمد نے بھی اپنی تصنیف کی ابتدا درسی کتابوں سے کی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آزاد نے مکاتب اور اسکول کے لڑکوں کے لئے لکھا اور انھوں نے اپنے بچوں خصوصاً لڑکیوں کی خانگی تعلیم کے لئے۔ مگر بعد میں سرکاری انعام اور عام شوق و دلچسپی نے مزید تصانیف کے لئے دروازہ کھول دیا۔

مولانا عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو کی ان کے متعلق رائے ہے کہ

"ایک بڑا کمال ان کی تصانیف میں یہ ہے کہ انھوں نے اسلامی سوسائٹی اور خاص کر اسلامی خاندان کی اندرونی معاشرت کی تصویر ایسی سچی اور بے لاگ کھینچی ہے کہ آنکھوں کے سامنے نقشہ پھر جاتا ہے اور ایک مسلمان پڑھنے والے کو رہ رہ کر شبہ ہوتا ہے کہ کہیں اس کے خاندان کے پترے تو نہیں کھل رہے ہیں ....
روزمرہ کے معمولی واقعات جو صبح و شام ہماری آنکھوں کے سامنے ہمارے گھروں میں اندر باہر واقع ہوتے رہتے ہیں، ان کا بیان کرنا مولانائے مرحوم پر ختم ہے اور بیان بھی کیسا؟ ایسا پُرلطف، ایسا سچا اور سلجھا ہوا کہ دل میں کھب جائے اور پڑھنے کے ساتھ ہی آنکھوں کے سامنے جیتی جاگتی، چلتی پھرتی تصویریں آجائیں۔ ایک وسیع اور عظیم الشان منظر کی تصویر کھینچنا جس میں پہاڑ بھی ہوں،

صحرا بھی ہوں، دریا بھی ہوں، آسان ہے لیکن انسانی خصائل
یا کسی ادائے خاص کی تصویر کھینچنا بہت مشکل ہے۔ یہاں
صرف اوپر نظر، جو بیرونی اشیا تک محدود ہو، کافی نہیں
بلکہ اسے عکس ریز (ایکس ریز) کی طرح جسم کے اندر گھس کر
دلوں کو بھی ٹٹولنا پڑتا ہے اور مولانا میں یہ قوت بدرجہ
کمال موجود تھی۔

یہ تصویر کا ایک رُخ تھا جسے میں نے موجودہ دور کے مشہور ترین
تنقید نگار کے الفاظ میں پیش کیا ہے، تصویر کا دوسرا رخ بھی ہے اجو
اسی قدر اہم ہے، جتنا پہلا۔ بقول مرزا فرحت اللہ بیگ "وہ چلتے چلتے
عربی الفاظ کے روڑے ہی نہیں بچھاتے، بلکہ پہاڑ رکھ دیتے ہیں۔" اور
اسی کے ساتھ دلی کے محاورے اس کثرت سے استعمال کرتے ہیں کہ
پڑھنے والے کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ مولانا کی تصنیف و تالیف کا بڑا
مقصد اصلاح تھا، خصوصاً معاشرتی اصلاح، اس لئے سہل اور سادہ
زبان کے استعمال کی ضرورت تھی، مگر مولانا نے اس قدر ثقیل اور غریب
الفاظ استعمال کیے ہیں کہ جاہل عورتیں جو مولانا کی اصل مخاطب تھیں،
تو خیر کیا سمجھیں گی، اچھا خاصا پڑھا لکھا آدمی بغیر قاموس کی مدد کے آگے
نہیں بڑھ سکتا۔ علی عباس حسینی صاحب لکھتے ہیں:۔

"بے شک و شبہ مولانا عورتوں کے مکالمے کے بادشاہ
ہیں۔ صنف نازک کا تکلم، طرز گفتگو، نشست الفاظ اور

روز مرہ و محاورہ پر جیسا انھیں عبور ہے، سوائے سرشار اور مرزا رسوا کے کسی کو نصیب نہیں۔ ان مقامات پر مولانا نے سلاست، روانی اور آمد کے دریا بہا دئے ہیں اور اتنی ٹکسالی زبان لکھی ہے کہ ہر فقرے پر جی لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے۔ مگر جس جگہ پر خود اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں یا مردوں کی گفتگو لکھی ہے، وہاں روانی کا دریا عربی کے ثقیل الفاظ کی چٹانوں سے بار بار ٹکرایا ہے۔ زور وہاں بھی بلا کا ہے بہاؤ میں کمی نہیں، مگر وہاں یہ سبزہ زاروں سے گذرتا ہوا دریا نہیں، بلکہ کہساروں سے الجھتی ہوئی ندی ہے۔ پھر ان مقامات کی زبان بھی دلی اور لکھنؤ کی ٹکسال کی پابند نہیں اس میں جگہ جگہ اس کے بین ثبوت ملتے ہیں کہ مولانا نے مدت العمر ایک دورہ کرنے والے ڈپٹی کی زندگی بسر کی ہے اور ان کا اصلی وطن دلی کا شہر نہ تھا، بلکہ یو پی کا بجنور۔"

افسانوں اور قصوں کے علاوہ مولانا نے چند مذہبی کتابیں بھی لکھی ہیں، جن میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ انھوں نے وہی افسانوی اور "حکایتی زبان" یہاں بھی استعمال کی ہے اور نہایت ثقہ اور سنجیدہ مباحث میں بھی وہی عامیانہ اسلوب اور طرز اختیار کیا ہے، جس کی وجہ سے ان کتابوں میں عالمانہ شان پیدا نہ ہو سکی مثلاً الحقوق والفرائض کا آغاز اس طرح فرماتے ہیں:۔

"کسی نے کیا اچھی تلی ہوئی باون تولے پاؤ رتی بات کہی
ہے کہ "من عرف نفسہ عرف ربہ"

الاجتہاد جیسی ثقہ کتاب کے چند جملے ملاحظہ ہوں۔

"اسی اثناء میں اتفاق سے مجھے تپ آنے لگی اور مسہلوں
تک نوبت پہنچی۔ ملالت کی حالت میں مجھ کو یہ خیال ہوا کہ اگر
میں اس بیماری کی حالت میں مرگیا تو کتے کی موت مرا۔ تم اپنی
ہستی کو کیوں بھولتے ہو، گدھی کمہار کی تجھے رام سے کو تہ۔ کہاں
راجہ بھوج کہاں بھجوا تیلی"

یہی عیب امہات الامہ میں تھا جس کی وجہ سے اس کے خلاف
اس قدر شور و ہنگامہ ہوا اور بالآخر اس کے تمام نسخے نذر آتش کرنے پڑے
لیکن بہر حال اس میں شبہ نہیں کہ اردو کی ترقی و فروغ میں مولانا کا بہت
بڑا حصہ ہے اور بقول مولانا عبدالماجد صاحب دریا آبادی "ان عناصر
خمسہ (بشمول سرسید) میں سے ہر عنصر بجائے خود پوری اہمیت رکھتا ہے اور
اپنے خصوصیات کے لحاظ سے بے نظیر ہے، ایک مرتب اور منظم سلسلہ ہے،
کسی ایک کڑی کو بھی اگر بے کار یا ناقص قرار دیا جائے تو سارا سلسلہ درہم و برہم
ہو جاتا ہے[۱]"

مولانا کی تصانیف حسب ذیل ہیں۔

---

[۱] مولانا شبلی اردو کے بہترین انشاپرداز، دیباچہ

ناول وحکایات :- مراۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح، ابن الوقت
محصنات، ایامیٰ، رویائے صادقہ، منتخب الحکایات

مذہبی و اخلاقی :- ترجمہ قرآن شریف، ادعیۃ القرآن، رد سورۃ الحقوق
والفرائض، مطالب القرآن، الاجتہاد، امہات الامہ

متفرق :- صرف صغیر، رسم الخط، مواعظ حسنہ، افسانہ عجائب
غدر، نصاب خسرو، چند پند، مبادی الحکمہ،
مائینیک فی الصرف، انگریزی کتابوں کے ترجمے
مثلاً تعزیرات ہند، قانون شہادت وغیرہ وغیرہ

مولانا کے خطوط اور تقریروں کے مجموعے بھی شائع ہوئے ہیں
"نظم بے نظیر" کے نام سے، ان کے اشعار کا مجموعہ بھی شایع ہوا ہے، مگر
یہ مولانا کی قابلیت و شہرت میں اضافہ تو خیر کیا کرے گا، لوگوں کی
بدظنی میں اور اضافہ کا باعث ہوگا۔

مولانا حالی ۱۸۳۷ - ۱۹۱۴

مولانا حالی کے زمانہ تک اردو زبان و ادب نے یقیناً بہت
کچھ ترقی کرلی تھی، مگر حالی نے اردو زبان و ادب میں ایک نئی جان ڈالی
اور نئے نئے عنوانات پر کتابیں لکھ کر، اس کے عروج و ارتقا میں نہایت
ممتاز اور نمایاں حصہ لیا۔
مولانا حالی کا سب سے بڑا کارنامہ، جس کی بنا پر وہ حالی ہوئے

یہ ہے کہ انھوں نے سوانح نگاری کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس سے پہلے اردو میں سوانح نگاری تھی ہی نہیں، تھی مگر مغربی طرز کی سوانح نگاری کی ابتدا، مولانا حالی کی کتابوں سے ہوئی، جیسا کہ آئندہ صفحات میں، ہم اس پر تفصیل سے بحث کریں گے، اس سلسلہ میں مولانا کی تین مستقل تصنیفیں ہیں، حیات سعدی، یادگار غالب اور حیات جاوید لیکن جس کی وجہ سے مولانا کو ہندوستان کے باسول Boswell کا خطاب ملا وہ حیات جاوید ہے

حالی کی سوانح نگاری کی ابتدا حیات سعدی سے ہوئی، فارسی شاعری سے مولانا حالی کو بڑا لگاؤ تھا، علاوہ ازیں طبیعت، رجحان اور ذوق میں سعدی اور حالی بہت حد تک ملتے جلتے تھے، دونوں میدان نظم و نثر کے یکساں شہسوار تھے، اور دونوں سادہ اور بے تکلف طرز تحریر کے مالک تھے، اگر سعدی شیرازی

براہ تکلف مرو سعدیا   اگر صدق داری بیار و بیا

کے علمبردار تھے، تو ہندی سعدی (حالی) کا بھی یہ قول تھا۔

صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام   ہاں سادگی سے آیؤ اپنی نہ باز تو

غالباً یہی وجوہ تھے جنھوں نے حالی کو سب سے پہلے حیات سعدی لکھنے کی طرف مائل کیا، بقول وال کر Walker "کسی بڑے آدمی کے ساتھ انصاف کرنے کے لئے کسی ایسے شخص کی ضرورت ہے، جو بڑائی اور عظمت کا خود بھی حامل ہو"[1] اس لئے حیات سعدی کی تالیف

[1] Victorian literature P 920

کے لئے مولانا حالی سے زیادہ کوئی اور موزوں نہیں ہو سکتا تھا۔

چونکہ یہ ایک قدیم شاعر کی سوانح حیات ہے، اس لئے مصنف کو قدیم تذکروں اور شاعر کی تصانیف کی مدد سے اسے ترتیب دینا پڑا ہے جسکی وجہ سے بعض فروگذاشتیں بھی ہو گئی ہیں، لیکن یہ وہ مقام لغزشش Pitfall ہے، جہاں صرف حالی ہی کے قدم نہیں پھسلے ہیں بلکہ Masse اور Sir Gore Ouslay جیسے یورپین سوانح نگاروں کے قدم بھی ٹھہر نہ سکے۔ حالی کو سعدی سے بے حد عقیدت تھی، لیکن پھر بھی حالی کا قلم جادۂ اعتدال سے ہٹنے نہ پایا، البتہ بعض تنقید نگاروں کو مصنف سے یہ شکایت ہے کہ انھوں نے سعدی کی غلط رایوں کی بھی حمایت کی ہے مثلاً سعدی کے اس خیال کی حمایت کرکے کہ "یہودی معزز اور شریف نہیں ہو سکتے" مولانا حالی نے یہودی قوم کے ساتھ سخت ناانصافی کی ہے۔

اسی طرح یادگار غالب لکھ کر حالی نے اپنی شاگردی کا حق ادا کیا ہے جس طرح شوپنہار (Schopenhauer) نے کہا تھا کہ "مرنے کے بعد وہ پہچانا جائے گا" اسی طرح غالب نے بھی پیشین گوئی کی تھی کہ

"شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن"

چنانچہ مرنے کے بعد، غالب کو جو شہرت اور ان کے کلام کو جو مقبولیت اور ہر دلعزیزی حاصل ہوئی، وہ ان کی زندگی میں حاصل نہ تھی اور یہ واقعہ ہے کہ انھیں روشناس کرانے اور ہر دلعزیز بنانے میں یادگار غالب کا

بہت بڑا حصہ ہے۔ غالب پر اب تک بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ لیکن بقول محمد اکرام صاحب "یہ صحیح ہے کہ یادگار غالب پرانے اصولوں پر لکھی گئی ہے اور جیسا کہ ڈاکٹر لطیف صاحب نے بتایا ہے، اس میں بہت سی خامیاں ہیں، لیکن ابھی تک کوئی اور تذکرہ ایسا نہیں شائع ہوا جس میں اس سے کم خامیاں ہوں، پھر یادگار کے مطالعہ سے وہ یک طرفہ اور غیر معتدلانہ رائے قایم ہونے کا کوئی احتمال نہیں، جو اور کتابوں کے مطالعہ سے قایم کی جاسکتی ہے[1]" چنانچہ باوجود اس کے کہ مولانا حالی غالب کے شاگرد تھے اور ان سے نہایت گہرے اور وسیع تعلقات رکھتے تھے، لیکن انھوں نے نہ تو ڈاکٹر لطیف کی طرح یہ لکھا کہ "وہ (غالب) بڑے لوگوں میں شمار بھی نہیں کیے جاسکتے"، اور نہ ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کی طرح یہ لکھ دیا کہ "ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، مقدس وید اور دیوان غالب" بلکہ انھوں نے افراط اور تفریط کے بیچ کی راہ اختیار کی اور ان کے قلم نے کہیں بھی اعتدال کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیا اور یہ وہ خصوصیت ہے، جو بہت کم مصنفوں کو حاصل ہے ورنہ زیادہ تر تو

اچھے اچھے حق شناس اور حق پسند اور دادگر
مکھیاں جیتی نگل جاتے ہیں پاس قوم میں

لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اس کتاب میں عیوب نہیں ہیں نقائص ہیں، کمیاں ہیں اور بقول مہر صاحب "یادگار غالب اپنی تمام خوبیوں

---

[1] غالب نامہ (دوسری اشاعت) صفحہ ۹۹

کے باوجود غالب کی صحیح، مفصل اور مستند سرگذشت حیات نہیں ہے"
مہر صاحب آگے چل کر ذرا تفصیل سے لکھتے ہیں:۔

"غالب کی زندگی کے حالات کی تحقیق و فراہمی کے لئے خواجہ حالی کو جو مواقع حاصل تھے، وہ کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہو سکتے تھے، خواجہ مرحوم غالب کے عزیز شاگرد تھے، تمام شاگردوں میں علم و فضل کے اعتبار سے افضل تھے، غالب کے نہایت ہی عزیز اور دیرینہ دوست نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے رفیق تھے، اکثر غالب سے ملتے رہتے تھے اور ان کے تمام حالات پوچھتے اور سنتے رہے ہوں گے، انھوں نے غالب کی زندگی میں ان کی تمام تصانیف (بہ استثنائے مکاتیب اردو) پڑھ لی ہوں گی اور جو تحریرات غالب کی زندگی کے واقعات و حالات کا مرقع تھیں، ان کے غیر واضح یا کم واضح حصوں کو خود غالب سے واضح کرا لیا ہوگا یا واضح کرا لینا چاہئے تھا، لیکن افسوس کہ یادگار ان توقعات کو پورا نہیں کرتی جو حالی اور غالب کے گہرے تعلقات کی بنا پر اس کتاب سے وابستہ کی جا سکتی ہیں، اگر شاعر اور ادیب کے سوانح حیات کی ترتیب کا حقیقی مدعا یہ ہوتا ہے کہ اس کی تصانیف کے فہم میں زیادہ سے زیادہ مدد ملے، اس ماحول کے متعلق زیادہ سے زیادہ آگاہی حاصل ہو جائے جس میں صاحب سوانح نے

زندگی گزاری، جس کی آغوش میں اس کے خیالات وافکار نے قالب حیات اختیار کیا اور نشوونما پاکر حروف والفاظ کا لباس پہنا، تو میری ناچیز رائے میں یادگار کی بلندی پایہ کے اعتراف کے باوجود کہنا چاہیے کہ وہ اس مدعا کی تکمیل کا مرقع نہیں بن سکتی غالب کی تصانیف کے مطالعہ کے دوران میں جابجا سوالات پیدا ہوتے ہیں، ان کے جواب کے لئے مشتاق نگاہیں یادگار کے صفحات کی طرف بے اختیار اٹھتی ہیں تو زیادہ تر ناکام واپس لوٹتی ہیں، بلکہ غالب کی تصانیف کے وقت غالب کی تمام تحریرات خواجہ مرحوم کے پیش نظر نہ تھیں لہذاہ ان سے بعض حیرت انگیز سہو سرزد ہوئے جن کی تفصیل آئندہ صفحات میں ملے گی [1]

لیکن اس کے باوجود یہ یاد رکھنا چاہیے کہ شبلی جیسے بے لاگ نقاد نے اسے اردو کی بہترین کتابوں میں شمار کیا ہے۔

اسی سلسلہ کی تیسری اور آخری کتاب حیات جاوید ہے، یہ وہ کتاب ہے جو حالی کے علمی کارناموں میں گل سرسبد کی حیثیت رکھتی ہے، یوں تو شبلی نے سوانح حیات پر ایسی کتابیں لکھی ہیں، جن کا جواب اردو ادب ہی میں نہیں بلکہ کسی اور زبان میں بھی ملنا مشکل ہے اور یہی وجہ ہے کہ شبلی کی بہت سی کتابیں

---

[1] غالب، تمہید صفحہ ۱۱، ۱۲۔

دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو رہی ہیں، لیکن حیاتِ جاوید کے مرتب کو جن زحمتوں اور دقتوں کا سامنا کرنا پڑا وہ شبلی کو پیش نہیں آئیں۔ حالی کو جن مشکلات سے دوچار ہونا پڑا، خود ان کے الفاظ میں ملاحظہ ہوں۔

"ہم کو اس کتاب میں اس شخص کا حال لکھنا ہے، جس نے چالیس برس برابر تعصب اور جہالت کا مقابلہ کیا ہے، تقلید کی جڑ کاٹی ہے، بڑے بڑے علمار و مفسرین کو للکارا ہے، اماموں او مجتہدوں سے اختلاف کیا ہے، قوم کے پکے پھوڑوں کو چھیڑا ہے اور ان کو کڑوی دوائیں پلائی ہیں، جس کو مذہب کے لحاظ سے ایک گروہ نے صدیق کہا ہے تو دوسرے نے زندیق کا خطاب دیا ہے اور جس کو پالیٹکس کے لحاظ سے کسی نے ٹائم سرور سمجھا ہے، تو کسی نے، نہایت راستباز لبرل جانا ہے، ایسے شخص کی لائف چپ چاپ کیونکر لکھی جا سکتی ہے، ضرور ہے کہ اس کا سونا کسوٹی پر کسا جائے اور اس کا کھرا پن ٹھوک بجا کے دیکھا جائے۔"[1]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:۔

"اگرچہ سرسید کی لائف کا لکھنا بظاہر ایک آسان کام معلوم ہوتا ہے، کیونکہ ۱۸۵۸ء سے لے کر آخر تک جو کچھ انھوں نے

---

[1] حیاتِ جاوید، دیباچہ صفحہ ۷، ۸

گیا، وہ سب چھاپے کے ذریعے سے مشہور ہو گیا ہے اور ۱۸۵۷ء کے پہلے کے واقعات بھی معتبر ذرائع سے معلوم ہو گئے ہیں، مگر درحقیقت ان کی تمام سوانح عمری کا سمیٹنا نہایت دشوار کام ہے۔ ان کی زندگی ایسے اہم واقعات سے بھری ہوئی ہے کہ نہ کسی واقعہ کو سرسری سمجھ کر چھوڑا ہی جا سکتا ہے اور نہ ہر ایک واقعہ کو مفصل بیان کیا جا سکتا ہے ایک دوست نے بالکل سچ کہا ہے کہ جس قدر سرسید کی زندگی میں ان کے مخالف یا موافق لکھا گیا ہے اور جس قدر ان کی وفات پر اطراف ہندوستان میں رنج و ماتم کا اظہار کیا گیا ہے، اگر صرف اسی کو جمع کیا جائے تو متعدد ضخیم جلدیں مرتب ہو سکتی ہیں، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جو شخص سرسید کی لائف ایک آدھ جلد میں ختم کرنی چاہتا ہے، اس کو کیا مشکل کام کرنا ہے، اس سے بھی زیادہ سخت مشکل جو بائیوگرافی کے مضمون سے علاقہ رکھتی ہے۔ یہ ہے کہ سرسید کی ذات میں اس قدر مختلف الجنس حیثیتیں جمع تھیں، کہ ہر ایک حیثیت پر اس کی شان اور درجہ کے موافق گفتگو کرنا ایک ایسا کام ہے، جس کا پورا حق وہی مصنف ادا کر سکتا ہے، جو خود بھی سرسید کے برابر جامع حیثیات ہو[1]"

---

[1] حیات جاوید۔ دیباچہ صفحہ ۷، ۸

اس لئے اس کتاب کی جس قدر تعریف کی جائے، اور مرتب کی مشکلات کو دیکھتے ہوئے، ان کو جس قدر بھی کامیابی ہوئی ہے اس پر جتنی بھی تعریف کی جائے، بجا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ میں یہ عرض کرنے کی بھی جرأت کروں گا کہ بہت سی خوبیوں کے باوجود اس میں بعض نقائص بھی ہیں۔ اس سے قطع نظر کہ حالی نے صاحب سوانح پر بے لاگ تنقید کی ہے یا محض تعریف و تحسین کی ہے، تصویر کے دونوں رخ دکھائے ہیں یا محض ایک، شبلی کے بقول محض کتاب المناقب اور مدلل مداحی ہے یا بہ خیال مرتب "نکتہ چینی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا گیا ہے"، اگر محض فنی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس میں بہت سے عیوب نظر آئیں گے اور یہی وجہ ہے جس کی بنا پر اسے "وہ شہرت اور مقبولیت حاصل نہ ہو سکی، جو اس کے ہیرو اور مصنف دونوں کے شایاں ہے"، جس کا اعتراف حالی کے خود حامیوں نے کیا ہے[1]

مولانا وحید الدین صاحب سلیم نے معارف (پانی پت) میں حیات جاوید پر ایک مبسوط تنقیدی مضمون لکھا ہے اور معترضین کے جوابات دئے ہیں، مگر آخر میں انھیں بھی اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ

"مولانا نے اس کتاب میں بہت سے مقامات پر سرسید کے مقالات، خیالات، عادات اور حالات پر نکتہ چینی کی ہے، مگر حق یہ ہے کہ جس شد و مد سے انھوں نے اس

---

[1] ملاحظہ ہو شیخ چاند مرحوم کا مضمون رسالہ اردو بابت جون ۱۹۳۵ء صفحہ ۳۳، ۳۴

امر کا وعدہ دیباچہ میں کیا ہے، اس کو وہ ایک شمہ بھی پورا نہیں کر سکے۔ اگرچہ ہم ان کو اس باب میں بالکل معذور تو نہیں خیال کرتے، تاہم ان کی طرف سے عذر پیش کیا جا سکتا ہے کہ ان کو نکتہ چینی کا بڑا موقع وہیں مل سکتا تھا جہاں انھوں نے سرسید کی تفسیر پر بحث کی ہے، اس موقع پر پہنچکر انھوں نے اپنے خیال میں اس سبب سے کہ کتاب حد سے زیادہ طویل ہو جائے گی اور ہمارے خیال میں اس سبب سے اکثر ان دقیق و عمیق فلسفیانہ اور عالمانہ بحثوں کے سمجھنے کی قابلیت عام ناظرین میں ہے، نہ اس قسم کے مضامین سے ان کو دلچسپی ہو سکتی ہے اس لئے بحث کو ادھورا چھوڑ دیا

افسوس ہے کہ دوسرے حصہ کی ترتیب جیسی ہونی چاہیے تھی، نہیں ہے، اس حصہ میں مختلف عنوان ہیں، جس ترتیب سے رکھے گئے ہیں، اس میں بہت کچھ اصلاح و ترمیم کی ضرورت ہے، بعض جگہ مضامین و عنوانات کی تکرار ہے، بعض مضامین کی تقریب تمام نہیں ہوئی، بعض موقعوں پر بیان میں گنجلک رہ گئی ہے " [1]

خود مولانا حالی تسلیم کرتے ہیں کہ :۔

---

[1] معارف (پانی پت) بابت جون و جولائی ۱۹۰۱ء صفحہ ۱۷۰، ۲۳۱

"میں ہرگز یہ خیال نہیں کرتا کہ میں نے اس عجیب و غریب شخص کی بائیوگرافی لکھنے کا پورا حق ادا کر دیا ہے، بلکہ مجھے اپنی کمزوریاں اور لغزشیں بخوبی معلوم ہیں اور میں علی الاعلان اقرار کرتا ہوں کہ مجھ سے اس بائیوگرافی کا حق ادا نہیں ہو سکا"

اس کی وجہ بھی مولانا نے ظاہر کر دی ہے، جو بالکل صحیح ہے اور اسی لحاظ سے یہ کتاب قابل تعریف ہے۔

"کسی متنفس نے قلم سے، درم سے، براہ راست اس کام میں مجھے مدد نہیں دی (الا ماشاء اللہ) پس اگرچہ یہ کام فی نفسہٖ کچھ قدر کے لائق نہ ہو، مگر اسی لحاظ سے کہ میں نے اس کے سرانجام کرنے میں اپنی پوری طاقت صرف کی ہے ضرور توجہ کے لائق ہے۔"

اگر بریاں کند بہرام گورے | نہ چوں پائے ملخ باشد امورے[1]

مولانا عبدالحق صاحب کو ایک اور خط میں لکھتے ہیں:۔

"مئی اور جون کا افسر پہنچا۔ حیات جاوید پر آپ کا ریویو دیکھا۔ جو کلمات بتقاضائے محبت، تصنیف و مصنف کے حق میں بے اختیار ٹپک پڑے ہیں، میں اگرچہ اپنے تئیں ان کا مستحق نہیں سمجھتا، لیکن بہر حال آپ کا شکریہ ادا کرنا

---

(۱) مکتوبات حالی، خط بنام مولانا عبدالحق صاحب حصہ اول صفحہ ۳۴

اپنا فرض جانتا ہوں، یہ وہی خصلت ہے جس کو اہل ایران
یار فروشی کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں اور ہماری زبان میں چھڑک
چھڑک کر بیچنا کہتے ہیں"(۱)

اسے کسی کسر نفسی پر محمول نہ کیا جائے، بلکہ یہ واقعہ ہے۔ مولانا حالی میں جہاں اور بہت سی خوبیاں تھیں وہاں یہ بھی تھی کہ وہ اپنی کمزوریوں کو تسلیم کرنے میں کبھی تامل نہ کرتے اور اگر ان کے ہمعصروں میں سے کسی کا ان سے موازنہ کیا جاتا اور تنقید میں حق و انصاف کو راہ نہ دی جاتی، تو وہ ضرور ٹوکتے چنانچہ مکتوبات حالی میں اس قسم کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ اگر حالی کے بجائے شبلی سر سید کی سوانح حیات لکھتے، تو وہ حیات جاوید سے بالکل مختلف ہوتی۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں کوئی عیب نہ ہوتا یا بالکل مکمل اور آخری کتاب ہوتی۔ مگر وہ اس قابل ضرور ہوتی کہ موجودہ حالات میں وہ نوجوانوں اور طالب علموں کی رہنمائی کا کام انجام دیتی۔ آج علمی حلقوں میں جس نقطۂ نگاہ سے سر سید کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے، اس حیثیت سے حیات جاوید کوئی رہنمائی نہیں کر سکتی سر سید کا اردو زبان و ادب کی ترقی و اصلاح میں بہت بڑا حصہ ہے، اس پر بہت کچھ لکھنا چاہیئے تھا مگر اس پر اتنا بھی نہیں لکھا گیا، جتنا شبلی نے ان کی وفات کے بعد ایک مختصر سے مضمون میں لکھا ہے اور جس میں سے ایک اقتباس، ہم سر سید کے سلسلہ میں

---

(۱) مکتوبات حالی حصہ اول صفحہ ۴۳

نقل کر چکے ہیں، سر سید نے تعلیم اور طریق تعلیم و تربیت کے متعلق بہت کچھ
سوچا اور غور کیا تھا مگر اس پر حیات جاوید میں اس قدر ناکافی بحث کی گئی
ہے کہ سر سید کے نظریوں کو معلوم کرنے کے لئے کسی اور چیز کا سہارا لینے پر
مجبور ہونا پڑتا ہے، علاوہ ازیں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس پر کوئی تنقید یا تبصرہ
نہیں کیا گیا جس سے ناظرین کو کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنے میں مدد ملتی، ظاہر ہے
شبلی اگر ترتیب دیتے تو ان کی سوانح نگاری کے پیش نظر یقین سے
کہا جا سکتا ہے کہ وہ ان تمام مسائل پر پوری طرح روشنی ڈالتے۔
غالباً یہی وجہ تھی جس کی بنا پر سر سید نے پہلے پہل شبلی سے اپنی سوانح
لکھانا چاہا تھا، مگر معلوم نہیں وہ کیا اسباب تھے جن کی بنا پر مولانا
راضی نہیں ہوئے، چنانچہ مولانا اقبال احمد صاحب سہیل لکھتے ہیں

"سر سید کو اپنی لائف مرتب کرانے کا خیال
پیدا ہوا اور یہ کام علامہ شبلی سے لینا چاہا، مولانا
اس سے پہلو بچانا چاہتے تھے چنانچہ اس بارے
میں جتنی بالواسطہ تحریکیں مولانا سے کی گئیں، ان کو
مولانا یہ لطائف الحیل ٹالتے گئے۔ آخر نواب اسمٰعیل خاں صاحب
رئیس دتاؤلی کا ایک خط بنام سر سید اس مضمون کا
آیا کہ نواب صاحب نے مکہ معظمہ میں یہ خواب دیکھا
ہے کہ مولوی شبلی آپ کی لائف لکھ رہے ہیں، مولانا
کو یہ خط دکھلایا گیا، مگر اس کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا

اس کے بعد سر سید مرحوم مولانا کو بلا کر کچھ حالات نوٹ
کراتے رہے اور مولانا بغیر کسی اضافہ یا کمی کے بجنسہ
املا کرتے جاتے تھے۔ اس طرح جب یہ آخری تدبیر بھی
ناکام رہی تو سر سید نے بادل ناخواستہ یہ خیال
ترک کر دیا اور مولانا حالیؔ کو اس کام کے لئے طلب
فرمایا" (۱)

مولانا شبلی اور مولانا حالی کی معاصرانہ چشمک؟

مولانا شبلی نے کسی نجی خط میں حیات جاوید کو کتاب المناقب
اور مدلل مداحی لکھ دیا تھا، اس پر نہ صرف حالی اسکول سے تعلق رکھنے
والے حضرات بہت خفا ہوئے بلکہ مہدی حسن جیسے شبلی سے عقیدت
رکھنے والے بھی اپنی تکلیف کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکے موصوف نے
صرف "معاصرانہ چشمک" کی تصنیف ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے بہت
سے خطوط میں بھی اس کی شکایت کی ہے۔ نامناسب نہ ہوگا اگر اس
سلسلہ میں شبلی اور حالی کے تعلقات پر ذرا تفصیل سے ایک نظر ڈالی جائے
میں سمجھتا ہوں کہ محض اس رائے کی بنا پر دونوں بزرگوں
کے درمیان معاصرانہ چشمک کی دیوار کھڑی کرنا صحیح نہیں ہوگا

---

(۱) رسالہ الاصلاح (سرائے میر، اعظم گڑھ) ستمبر ۱۹۳۸ء صفحہ ۵۵۳

کیونکہ شبلی اور حالی دونوں کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے تعلقات نہایت اچھے اور گہرے تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے، دونوں ایک دوسرے کی عزت اور احترام کرتے تھے، دونوں ایک دوسرے کی علمی قابلیت کے معترف تھے اور دونوں کو ایک دوسرے کی کتابوں کا انتظار رہتا تھا۔ مولانا حالی شبلی کو ایک خط میں لکھتے ہیں

" مولانا!

بنفسی ما بہ جارالبشیر   وما افدی بہ شئی یسیر

اس قدر مدت کے بعد عنایت نامہ کے ورود نے میری آنکھوں کے ساتھ وہی کام کیا، جو پیراہن یوسف نے چشم یعقوب کے ساتھ کیا تھا، میری کوتاہ قلمی سے آپ یہ سمجھے ہوں تو کچھ تعجب نہیں کہ میں آپ کے حقوق صحبت کو بھول گیا ہوں، مگر مولانا! یہ تغافل اسی قسم کا ہے جس کی نسبت کہا گیا ہے۔ ع

تغافلے کہ کم از صد نگاہِ حسرت نیست

.... آپ کی تصنیفات کی نسبت میں اس سے زیادہ کچھ نہیں لکھ سکتا کہ من عرف منزلتکم فی التصنیف کل لسانہ آپ کا وجود قوم کے لئے باعث فخر ہے"(۱)

---

(۱) معارف اعظم گڑھ دسمبر ۱۹۱۶ء صفحہ ۵۸

ایک اور خط میں لکھتے ہیں۔

"میرا ارادہ تھا کہ اپنا فارسی کلام نظم و نثر جو کچھ بھی ہے اس کو بھی چھپوا کر شائع کر دوں، مگر دستۂ گل (مولانا شبلی کی ایک فارسی نظم جو کتابی شکل میں شائع ہوئی تھی) کے دیکھنے کے بعد میری غزلیں خود میری نظر سے گر گئیں۔ ولیس فی ذالک شائبتہ من التصنع"(۱)

مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کو لکھتے ہیں۔

"باعث تصدیع یہ ہے کہ ضلع آرہ سے ایک سوال خاکسار کے پاس پہنچا ہے، جس میں لفظ تنکہ جو ہندوستان کے سلاطین کے دفاتر میں مستعمل تھا، اس کے متعلق بہت سی باتیں دریافت کی ہیں، جن کا جواب جناب مخدومی مولانا شبلی صاحب بالقابہ کے سوا لکھنے والا کوئی نظر نہیں آتا، لیکن چونکہ مولانا نہایت عدیم الفرصت ہیں، ان کو اس کام کی تکلیف نہیں دی جا سکتی، مگر اُمید ہے کہ آپ مولانا کی امداد اور رہبری سے اور مولانا کے بیش قیمت کتب خانہ کی مدد سے اس مشکل کو باحسن وجوہ حل فرما سکیں گے۔ میں نہ تو اس

(۱) معارف (اعظم گڑھ) اپریل ۱۹۱۷ء صفحہ ۹۴

کام کا اہل ہوں اور نہ میرے پاس وہ کتابیں موجود ہیں جن سے اس سوال کے جواب لکھنے میں مدد مل سکے" (۱)

مولانا عبدالحق صاحب کو لکھتے ہیں :۔

"جن لوگوں کو آپ نے اس غرض سے انتخاب کیا ہے کہ ان کے کلام پر کرٹکل اِسے لکھے جائیں، ان میں سے ایک شخص کا نام ہونے اور ایک کا نہ ہونے سے نہایت تعجب ہوا۔ مولوی سید احمد صاحب میرے نہایت دوست ہیں اور اردو ڈکشنری لکھنے میں جو محنت اور استقلال انھوں نے دکھایا ہے، اس کی میں دل سے قدر کرتا ہوں، ان کی ڈکشنری پر سنشہ میں ایک لمبا ریویو میں خود لکھ چکا ہوں مگر ماڈرن اردو لٹریچر کا ہیرو میں ان کو نہیں کہہ سکتا اور اس سے بھی زیادہ تعجب شمس العلما مولوی شبلی نعمانی کا نام چھوڑ دینے پر ہے اس فرو گذاشت کو سوا اس کے کہ آپ کو انتخاب کرتے وقت ان کا خیال نہ آیا ہو، میں اور کسی بات پر محمول نہیں کر سکتا" (۲)

---

(۱) معارف (اعظم گڑھ) جنوری ۱۹۱۶ء صفحہ ۵۶ - (۲) مکتوبات حالی حصہ اول صفحہ ۳۴

ٹھیک اسی طرح مولانا شبلی کو بھی حالی سے دلی محبت تھی، مولانا شبلی نے حالی کو جو خطوط لکھے تھے، وہ غالباً محفوظ رکھے نہ جا سکے کم از کم شائع نہیں ہوئے، البتہ دوسرے خطوط میں کہیں کہیں ان کا جو ذکر آیا ہے، اس سے اس قدر و منزلت اور عزت و احترام کا اظہار ہوتا ہے جو مولانا شبلی کو حالی سے تھا، مولانا شبلی ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"ایک کتاب حال میں مولوی حالی صاحب نے لکھی ہے اور مجھ کو تحفہ بھیجی ہے۔ یہ شیخ سعدی کی نہایت دلچسپ محققانہ سوانح عمری ہے، میں نے بے اختیار اس کو تمہارے لئے پسند کیا اور مولوی حالی صاحب کو لکھ دیا ہے کہ وہ تمہارے نام بھیجدیں، دیکھو کہیں واپس نہ جائے قیمت ایک روپیہ چار آنے ہے، واقعی بے مثل ہے، اور تم کو اپنے پاس رکھنا نہایت ضروری ہے، باقی خیریت ہے، اس کتاب کے اور بھی خریدار پیدا کرنے چاہئیں" (۱)

حاجی مولوی رشید الدین صاحب انصاری نے، غالباً مرزا غالب پر کچھ لکھنے کے لئے مولانا شبلی کو لکھا تھا، اس کے جواب میں مولانا نے انھیں لکھا کہ "مرزا غالب کے حالات

---

(۱) مکاتیب شبلی حصہ اول صفحہ ۷۹

وریویو مولوی حالی صاحب نے جس تفصیل سے لکھے ہیں، اس کے بعد کسی اور کتاب کی کیا ضرورت ہے۔"(۱)

کیا ان تحریروں کی موجودگی میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ حالی و شبلی میں معاصرانہ چشمک تھی، یا شبلی نے حیات جاوید کو کتاب المناقب اور مدلل مداحی اس لئے کہا کہ وہ حالی سے معاصرانہ چشمک رکھتے تھے؟! میں سمجھتا ہوں کہ ایسا کہنا بہت بڑی زیادتی ہے۔ رہا حیات جاوید کے متعلق شبلی کا تبصرہ تو اس کا واقعہ غالباً یوں ہے۔ مولانا شبلی کو مولانا حالی کے علم وفضل اور خصوصیت کے ساتھ ان کی سوانح نگاری کا اعتراف تھا، حیات جاوید کی ترتیب سے قبل سوانح حیات پر دو کتابیں لکھ چکے تھے، ان کتابوں کی جو قدرومنزلت شبلی کے دل میں تھی اسے ہم اوپر درج کر چکے ہیں، اس لئے انھیں جب معلوم ہوا ہوگا کہ مولانا حالی، سرسید کی سوانح حیات ترتیب دے رہے ہیں، تو قدرتی طور پر اس کے متعلق ان کی توقعات بہت زیادہ رہی ہوں گی چنانچہ اس کا انھوں نے اظہار اس مضمون میں اشارۃً کیا ہے، جو سرسید کی وفات پر لوگوں کے اصرار سے لکھا تھا، مولانا لکھتے ہیں:-

"یہ کام درحقیقت مولانا حالی کا ہے، وہ لکھیں گے اور خوب لکھیں گے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ لکھ چکے ہیں ——

---

(۱) مکاتیب شبلی حصہ اول صفحہ ۲۱۸۔

اور خوب لکھا ہوگا، میں کالج کی طرف سے مجبور کیا گیا تھا، اس وقت جبکہ تمام ملک میں سرسید کا آوازہ ماتم گونج رہا ہے اور ہر شخص ان کے کارناموں کے سننے کا شائق ہے، کچھ نہ کچھ مختصر طور پر فوراً لکھنا چاہئے، میں نے اس کی تعمیل کی، ورنہ میں مولانا حالی کی مقبوضہ سرزمین میں مداخلت کا کوئی حق نہیں رکھتا اور اس شعر کا مصداق بننا نہیں چاہتا۔

اٹھا چکے ہیں زمیندار، جن زمینوں کو بھلا تردد بے جا سے اس میں کیا حاصل"[1]

لیکن جب کتاب منظر عام پر آئی، تو شبلی کو بڑی مایوسی ہوئی اسی درمیان میں مولانا حبیب الرحمان خاں صاحب شروانی نے انھیں خط لکھا اور حیات جاوید کے متعلق اپنی رائے لکھی، اس کے جواب میں مولانا نے انھیں لکھا۔

"والا نامہ پہنچا۔ اختلاف آرا بھی کیا چیز ہے حیات جاوید کو میں لائف نہیں بلکہ کتاب المناقب سمجھتا ہوں اور وہ بھی غیر مکمل۔ خیر! وللناس فیما یعشقون مذاہب"[2]

انھیں کو پھر ایک اور خط میں لکھا۔

"والا نامہ پہنچا۔ حیات جاوید میں مولانا نے سید صاحب

---

(۱) مقالات شبلی حصہ صفحہ۔ (۲) مکاتیب شبلی حصہ اول صفحہ ۱۲۱

کی ایک رخی تصویر دکھائی ہے، اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ
کسی کے معائب کو دکھانا تنگ خیالی اور بد طینتی ہے، لیکن
اگر یہ صحیح ہے تو موجودہ یورپ کا مذاق اور علمی ترقیاں
سب برباد ہو جائیں۔ پھر ایشیائی شاعروں میں کیا برائی
ہے، سوائے اس کے کہ وہ محض دعویٰ کرتے تھے، واقعات
کی شہادت پیش نہیں کرتے تھے، بہر حال میں حیات جاوید
کو مدلل مداحی سمجھتا ہوں" (۱)

مگر یہ خصوصیت صرف مولانا شروانی کو حاصل تھی، جن کے خط میں
مولانا نے بے تکلفانہ حیات جاوید کے متعلق اپنی صحیح رائے ظاہر کر دی
ورنہ جب مولانا کے نہایت عزیز اور ابتدائی شاگرد مولوی عبدالسمیع صاحب
نے حیات جاوید کے متعلق ان کی رائے دریافت کی، تو پہلوتہی کر گئے
اور انھیں لکھ دیا کہ "حیات جاوید کے متعلق رائے پوچھتے ہو۔ میں کچھ
کہنا نہیں چاہتا، تم مقلد نہیں، مجتہد ہو، پھر تقلید کیوں کرو، وہ بھی
چھوٹی امت کی" (۲)

ان سب باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کی یہ رائے
معاصرانہ چشمک یا کسی اور وجہ سے نہیں تھی، بلکہ یہ ان کی حقیقی رائے
تھی، جسے انھوں نے مجبوراً اور نجی خطوط میں ظاہر کیا تھا، اب رہا

---

(۱) مکاتیب شبلی حصہ اول صفحہ ۱۴۱۔ (۲) ایضاً صفحہ ۱۱۰

یہ مسئلہ کہ شبلی کی یہ رائے صحیح تھی یا غلط تو مولانا وحیدالدین صاحب سلیم کا تبصرہ ہم اوپر کہیں درج کر چکے ہیں۔ مولانا نے یہ تسلیم کیا ہے کہ "جس شدومد سے انھوں نے اس امر کا وعدہ دیباچہ میں کیا ہے، اس کو وہ ایک شمہ بھی پورا نہ کر سکے" اس لئے یہ وہ جرم ہے جس کا ارتکاب صرف شبلی ہی نے نہیں، بلکہ ان لوگوں نے بھی کیا ہے، جو مولانا حالی کے خاص لوگوں میں تھے اور ظاہر ہے ایسی شکل میں شبلی کا "قصور" بہت ہلکا ہو جاتا ہے۔

مولانا حالی کی بقیہ کتابیں

مولانا حالی کی ایک اہم اور مشہور تصنیف "مقدمہ شعروشاعری" ہے، جس میں فن شاعری پر کسی قدر فلسفیانہ اور ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے نیز غزل میں مروجہ بیان حسن وعشق میں اصلاح کی ضرورت بیان کی گئی ہے "تاریخ ادب اردو" کے فاضل مصنف کی اس کے متعلق رائے ہے۔

"مقدمہ گو بڑی قابلیت سے لکھا گیا ہے، مگر کسی قدر سطحی"[1] ہے ۔ ۔ ۔ ۔ یورپین شاعری میں مولانا حالی تہ تک غوطہ نہیں لگا سکتے کیونکہ اس بحر کے وہ شناور نہیں ہیں، سنسکرت کی شاعری کو بوجہ

---

(۱) تاریخ ادب اردو حصہ نظم صفحہ ۴۸۶

عدم واقفیت زبان بالکل چھوڑ دیا ہے"(۱)

لیکن اس کے باوجود اس لحاظ سے نہایت قابل عزت اور قابل قدر ہے کہ یہ اردو ادب میں تنقید نگاری کی پہلی کوشش ہے اردو زبان میں اس سے پہلے تنقید نگاری بالکل ناپید تھی، حالی نے یہ مقدمہ لکھ کر تنقید نگاری کا سنگ بنیاد رکھا، لیکن حالی اسکول کے بعض پیرو اس کی تعریف میں بہت مبالغہ کرتے ہیں، جو صحیح نہیں۔ شیخ چاند مرحوم اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"یہ فن شعر پر ایسی بلند پایہ اور حکیمانہ تنقید ہے کہ اسلامی ادبیات میں نہ تو اس سے پہلے لکھی گئی اور نہ آج تک کسی کو لکھنے کی ہمت ہوئی" (۲)

ایک اور نقاد صاحب فرماتے ہیں :۔

"اس مقدمہ کے متعلق یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ اردو تو اردو فن شعر و شاعری پر ایسی بلند پایا اور فلسفیانہ تنقید نہ عربی میں ہے، نہ فارسی میں، دیگر مشرقی زبانوں کی ہمیں خبر نہیں" (۳)

مجھے افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ ان دونوں تنقید

---

(۱) تاریخ ادب اردو حصہ نثر صفحہ ۱۵۳ (۲) رسالہ اردو بابت جنوری ۳۵ء صفحہ ۳۵

(۳) "زمانہ" حالی نمبر صفحہ ۶۲

تنقید نگاروں میں سے، غالباً کسی نے بھی عربی لٹریچر کا مطالعہ نہیں کیا ہے، ورنہ وہ ایسی بات نہ کہتے، عربی تنقید نگاری کے آغاز اور اس کے عروج و ارتقار پر یہاں بحث کرنے کی گنجائش نہیں ہے، اس لیے میں اس بحث میں نہیں پڑ سکتا کہ "اسلامی ادبیات" اور "عربی و فارسی" میں ایسی بلند پایہ کتاب ہے یا نہیں، لیکن اتنا ضرور عرض کروں گا کہ مقدمہ میں جہاں تک فنی حیثیت سے بحث کی گئی ہے، وہ تمام تر عربی کتب سے ماخوذ ہے۔

مولانا کی چند کتابیں مذہب پر بھی ہیں، لیکن اولاً تو ان کی تعداد بہت کم ہے، دوسرے ان کا معیار مقابلتہً پست ہے، مولانا نذیر احمد کی مذہبی کتابیں ان سے کہیں بہتر اور معیاری ہیں۔ درحقیقت مولانا نے یہ کتابیں اس وقت لکھی ہیں، جب وہ حالی نہیں تھے، بلکہ ایک مولوی تھے اور بس!

اس تنقید سے میرا مدعا یہ کبھی نہیں ہے کہ خدانخواستہ مولانا حالی کا نثر— اردو کی ترقی و عروج میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ ایسا سمجھنا بہت بڑی غلطی ہوگی۔ مولانا نے اردو زبان و ادب کی بہت بڑی خدمت کی ہے، اور اس کے ارتقا میں اپنے پیشروؤں سے دو چار قدم آگے ہی ہیں، شعر و شاعری کی اصلاح و ترقی میں خصوصیت کے ساتھ مولانا کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے، جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہماری زبان اور ہماری شاعری مولانا کے احسان سے

کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ بقول ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب

"حالی بہت بڑے شاعر اور نقاد تھے اور کچھ اس سے
بھی بڑھ کر تھے، وہ اپنے زمانہ کے ادبی مجدد تھے،
جنھوں نے ملک کے بگڑے ہوئے مذاق کو سدھارا اور
سنوارا اور اردو ادب کو پستی سے نکال کر بلندی کی
راہ دکھائی۔

حالی کی نثر بھی اپنے رنگ میں پختگی و سادگی کی وہی
آن رکھتی ہے، جو ان کی نظم میں ہے، سب سے بڑی بات
یہ ہے کہ عبارت کی سلاست اور روانی کے ساتھ معانی
کی صحت اور لہجہ کی متانت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔
علمی مسائل اور ادبی نکات کو صاف اور سلجھے ہوئے فقروں
میں اس طرح لکھنا کہ ہلکاپن نہ پیدا ہونے پائے اگر کسی
کو آتا ہو، تو اس نے حالی ہی سے سیکھا ہوگا" (۱)

مولانا کی نثر و نظم میں کل حسب ذیل کتابیں ہیں۔

تریاق مسموم، تاریخ محمدی پر منصفانہ رائے، طبقات الارض،
شواہد الالہام، اصول فارسی، سوانح عمری حکیم ناصر، مجالس النساء، دو
حصے، مولود شریف، حیات سعدی، مقدمہ شعر و شاعری، یادگار غالب

---

(۱) مسدس حالی، صدی ایڈیشن صفحہ ۵، ۱۳

حیات جاوید، اپنے استاد مولانا عبدالرحمٰن کی سوانح عمری، مسدس مد و جزر اسلام، دیوان حالیؔ، مجموعۂ نظم حالی، ان کے علاوہ ان کے متفرق مضامین کے مجموعے، مقالات حالی دو حصوں میں، مضامین حالی اور مکتوبات حالی کے دو حصے بھی شائع ہوئے ہیں۔

مولانا شبلی ۱۸۵۷-۱۹۱۴

ترتیب کے لحاظ سے گو مولانا شبلی کا نام عناصر اربعہ میں سب سے بعد میں آتا ہے، لیکن کارناموں اور علمی خدمات کے لحاظ سے سر فہرست ہیں۔ بقول سید انصاری صاحب، مصنف مولانا شبلی بحیثیت اردو کے انشاپرداز "آزاد نے اردو زبان و ادب کا سنگ بنیاد رکھا اور نذیر احمد و حالیؔ نے اس پر بہت کچھ اضافے کئے لیکن اس تعمیر کی تکمیل جس نے کی وہ شبلی کی ذات تھی۔" شبلی کو علم و ادب کا جو ذخیرہ ملا، وہ دینیات، تاریخ، سوانح اور تنقیدات پر مشتمل تھا، انھوں نے نہ صرف یہ کہ ان میں بیش بہا اضافے کئے، بلکہ جدید طرز تصنیف سے اردو کو آشنا کیا اور یہ صرف شبلی کا کارنامہ ہے کہ اردو اس قابل ہوئی کہ ہندوستان کی علمی زبان کہلا سکے، اور دوسری ترقی یافتہ زبانوں سے آنکھیں ملا سکے شبلی اپنی تحقیقات کے لحاظ سے، چاہے تاریخ میں ہو یا ادب و زبان میں اس قدر آگے ہیں کہ ان کے معاصرین میں سے کوئی ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکا، مہدی حسن مرحوم

نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ "آج کل کے مصنفین میں علامہ شبلی کو ایک خاص امتیاز اور فوقیت حاصل ہے، جو ان کے ہمعصروں کے حصہ میں نہیں آیا، ان کے سخت سے سخت حریف مقابل بھی ان کی تحقیقات کی گرد کو نہیں پہنچے۔ بعضوں نے موضوع سخن ایسا اختیار کیا ہے کہ اگر زمانہ کی رفتار یہی رہی تو زیادہ جیتے معلوم نہیں ہوتے نذیر احمد اپنی لایق رشک عربیت کے ساتھ بھی کچھ یونہی سے رہے، ــــــ حالی نے مسدس کے ساتھ مقدمہ رشاعری اور حیات جاوید لکھ کر اپنا ٹھکانا کر لیا، شبلی قطعاً غیر فانی ہیں۔ آج ہزاروں صفحے، متعدد جلدیں لیں ان کے قلم سے نکل چکے ہیں اور جس موضوع پر جو کچھ لکھا گیا ہے کسی زبان میں اس سے بہتر مجموعۂ خیال موجود نہیں "(۱)

مولانا نے تصنیف و تالیف شروع کرنے سے قبل، ایک طرف اردو کا جائزہ لیا اور بدلے ہوئے زمانے اور یورپ کی بڑھتی ہوئی ترقی پر نظر ڈالی اور دوسری طرف اسلاف کے علمی کارناموں اور عہد دولت عباسیہ کی علمی خدمات اور دوسری زبانوں سے تراجم کو بہ نظر غائر دیکھا اور ایک مکمل اسکیم مرتب کی۔ مولانا کی اس اسکیم کو پڑھیئے اور اس کے بعد مولانا کی تصانیف پر نظر ڈالئے تو اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کی صحت اور صداقت صاف ظاہر ہو جائے گی

---

(۱) افادات مہدی صفحہ ۷۷

مولانا کی اسکیم اور اسکیم بناتے وقت جو خیالات اور مقاصد پیش نظر تھے، بتامہا ذیل میں درج کی جاتی ہے، اس سے اردو کے سب سے بڑے محسن کی قابلیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

"تھوڑی دیر کے واسطے یہ فرض کرنا چاہیئے کہ زمانہ اپنی موجودہ ضرورتوں کے ساتھ قائم ہے، لیکن بجائے موجودہ نسل کے، ہمارے اسلاف کا علمی گروہ، دوبارہ دنیا میں آگیا ہے۔ اس حالت میں غور کرو، اس گروہ کے علمی مہمات کیا ہوں گے؟ اس سوال کا جواب قیاسی اور فرضی نہیں، بلکہ اصول تجربہ کے موافق دیا جا سکتا ہے علمائے سلف اور ان کے علمی کارنامے دونوں ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں، نیز ہر شخص جانتا ہے کہ دولت عباسیہ کے زمانے تک تمام اسلامی علوم بالکل سادگی اور ایک رخی کی حالت میں تھے، دولت عباسیہ کے وجود کے ساتھ، جب نئی ضرورتیں پیدا ہوئیں تو دفعتہً ایک انقلاب ہوگیا۔ سب سے پہلے علمار کا ایک گروہ پیدا ہوا جس نے یونانی، سریانی، کلدانی، ہندی اور قبطی زبانوں کے علوم و فنون ترجمہ کے ذریعہ سے عربی زبان میں منتقل کردئے ایک دوسرے گروہ نے ان نمونوں کو سامنے رکھ کر اسلامی علوم کے سادہ ایوان پر مینا کاریاں اور نقش آرایاں

کیں، عقائد نے علم کلام کی صورت اختیار کی، عربیت نے
ریٹرک (معانی و بلاغت) کا قالب بدلا، اصول فقہ میں
منطقی استدلالات پیدا کئے، تفسیر میں فلسفہ کی آمیزش
ہو گئی، فرائض میں علم حساب کے دقیق اصول شامل
ہو گئے، ان باتوں کے ساتھ علوم قدیمہ کی غلامی نہیں
کی، بلکہ جو کچھ کیا آزاد و خود مختار بن کر کیا، جہاں غلطیاں
دیکھیں اصلاح کی، جو فضول حصہ تھا، اس کو الگ کر دیا
پریشان اور غیر مرتب مسائل نئے سرے سے درست
کئے جس قدر حصہ اسلامی علوم میں تحلیل ہو سکتا تھا تحلیل
کیا، جو بالکل جدا تھا، اس کو مستقل حیثیت سے قائم رکھا۔"

اس کو پڑھنے سے، معلوم ہوتا ہے کہ شبلی کا مطالعہ اور
ان کی نظر کس قدر وسیع تھی، عالم اسلام کی تمام ترقیاں ان کے
علم میں تھیں اور وہ اس کے فلسفہ اور اسرار و رموز سے پوری
طرح واقف تھے، اس کے بعد موجودہ ضروریات اور احتیاجات
پر مولانا کا تبصرہ ملاحظہ ہو، کس قدر جامع اور کس قدر صحیح نگاہ
ڈالی ہے اور پھر استنتاج کس قدر صائب ہے۔

"آج بعینہٖ اسی قسم کی حالت اور اسی قسم کا موقع
ہے، یورپ نے تمام علوم و فنون کا قالب بدل دیا
ہے، فلسفہ نے بالکل نئی صورت اختیار کی ہے،

منطق میں نئے برگ وبار پیدا ہوئے ہیں، معانی و بلاغت کا اسلوب بدل گیا ہے، تاریخ ایک قسم کا فلسفہ بن گئی ہے، مذہبی مباحث کے نئے نئے پیرایے نکل آئے ہیں۔

اسی گذشتہ خیال کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج اگر اسلاف موجود ہوتے تو علوم و فنون جدیدہ کو پیش نظر رکھ کر وہی کرتے، جو انھوں نے علوم قدیمہ کے ساتھ کیا تھا، علم کلام کو فلسفہ جدید کے مقابلہ میں مرتب کرتے، تاریخ اور واقعہ نگاری کا انداز بدلتے، مسائل جدیدہ کو تحقیق کی نگاہ سے دیکھتے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تمام علوم و فنون کے متعلق قدیم وحال کی تحقیقات کا موازنہ کرتے اور دونوں کے عیب و ہنر دکھا کر فیصلہ کرتے کہ کیا چیزیں کس حد تک قبول کے قابل ہیں اور ان کی تحقیقات کو علوم قدیمہ کے ساتھ کیونکر پیوند کیا جا سکتا ہے، ان کے نمونے پر علوم قدیمہ کی روش کیونکر بدل سکتی ہے، ان کی روشنی میں ہم اس قدر معلوم کر سکتے ہیں کہ نئے راستہ میں کیونکر قدم اٹھانا چاہیے اور قدیم و جدید راہیں کہاں جا کر مل جائیں گی "

اس تمہید کے بعد اصل اسکیم ملاحظہ ہو۔

"(۱) فلسفۂ حال کے اصول اور اس کا معتد بہ حصہ ملکی زبان میں لایا جائے۔

(۲) یہ بتایا جائے کہ فلسفۂ حال کے کون کون سے مسائل مذہب کے خلاف ہیں، پھر اُن مسائل کو یا رد کیا جائے یا مذہب سے تطبیق دی جائے۔

(۳) جس قسم کے مضامین پر آج کل یورپ میں تصنیفات ہو رہی ہیں اور جن پر اسلامی تصنیفات بھی موجود ہیں۔ ان میں موازنہ کر کے بتایا جائے کہ مسلمانوں کا طرز تصنیف کیا تھا اور یورپ کا طرز تصنیف کیا ہے، مثلاً تاریخ، اسمار الرجال، معانی و بلاغت، تحقیقات مذہب میں عربی زبان میں کثرت سے تصنیفات موجود ہیں، انھی مضامین نے یورپ میں نئے نئے اسلوب اختیار کئے ہیں، موازنہ کر کے بتایا جائے کہ دونوں کے مختلف خصوصیات کیا ہیں اور کس کو کس حیثیت سے ترجیح ہے

(۴) خالص اسلامی علوم مثلاً کلام، فقہ، اصول تفسیر وغیرہ کی تاریخ اور ان پر ریویو لکھا جائے یعنی یہ کہ یہ علوم کب پیدا ہوئے، کیونکر بڑھے، کس کس

زمانہ میں کیا کیا باتیں ان پر اضافہ ہوتی گئیں اور
کن اسباب سے ہوئیں، ان کا کس قدر حصہ صحیح ہے
کس قدر تنقید اور اصلاح کا محتاج ہے۔

(۵) فارسی اور عربی شاعری اور انشارپردازی
کی تاریخ لکھی جائے۔

(۶) جن نئے عنوانوں پر یورپ میں مضامین
لکھے جارہے ہیں، اردو زبان میں ترجمہ کے ذریعہ
لائے جائیں۔

(۷) مسلمانوں کی تہذیب و تمدن پر تاریخی
مضامین لکھے جائیں، مثلاً انتظام عدالت، انتظام
محاصل، پبلک ورکس، تعلیمات، تجارت، فوجی
نظم ونسق، معاشرت، غرض اس قسم کے تمام امور
کی نسبت مورخانہ طور پر لکھا جائے کہ مسلمانوں نے
ان چیزوں میں کہاں تک ترقی کی اور کس کس عہد
میں کیا اضافہ ہوا"

مجھے یقین ہے کہ اس اسکیم کے علاوہ شبلی اور کچھ بھی نہ لکھتے
جب بھی ان کی علمیت، ان کی واقفیت، ان کا علم وفضل اور
عناصر اربعہ میں ان کا تفوق و برتری بالکل مسلم تھی۔ کیونکہ
ایسی جامع ومانع اسکیم کوئی ایسا ہی شخص بناسکتا ہے، جو غیر معمولی دل دماغ

کا مالک ہو اور جو تمام مشرقی علوم و فنون پر نظر رکھتا ہو۔
شبلی کی یہ اسکیم کسی ایک شخص کے بس کی نہیں تھی، بلکہ علمائے ادب اور اصحابِ قلم کی ایک منتخب جماعت سالہا سال میں اسے پورا کر سکتی تھی، مگر شبلی کی جراَت و ہمت ان کے دل و دماغ کی خوبی اور اردو زبان و ادب سے ان کا غیر معمولی عشق ملاحظہ ہو کہ اس اکیلی ذات نے اس اسکیم کو عملی جامہ پہنایا، اور حق تو یہ ہے کہ شبلی کے علاوہ کوئی اور شخص اس کام کو انجام بھی نہیں دے سکتا تھا، یہ صرف شبلی کی ہمہ گیری اور جامعیت تھی کہ اگر ایک طرف مورخ تھے، تو دوسری طرف ادیب اور بہترین نقاد، اگر ایک طرف شاعر تھے، تو دوسری طرف جید عالم، اگر فلسفۂ قدیم و جدید پر عبور تھا تو تعلیم میں بھی پوری دستگاہ رکھتے تھے، غرض علم و ادب کے تمام شعبوں اور تمام اصناف پر شبلی حاوی تھے۔
عناصرِ اربعہ میں ایک شبلی ایسے شخص تھے، جنھیں قدرت کی طرف سے سب سے کم عمر ملی، مگر اس کے باوجود انھوں نے اتنی کتابیں لکھی ہیں یا بہ الفاظ دیگر اردو زبان و ادب میں انھوں نے اتنا عظیم الشان اضافہ کیا ہے کہ ان کے بیشتر اپنی طویل عمر میں، اس کے نصف بھی اضافہ نہ کر سکے، شبلی کی تمام کتابوں پر تبصرہ کرنے اور ان کی خصوصیات اجاگر کرنے کی،

اس محدود مضمون میں گنجایش نہیں ہے، اس لئے صرف ان کے نثر کے کارناموں کو مختلف عنوانات کے ماتحت تقسیم کرکے ہر ایک پر اجمال کے ساتھ روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی مگر تطویل سے بچنے کے لئے صرف اہم کتابوں پر تنقید کی جاسکے گی۔

تاریخ وسوانح

مغربی اسلوب اور تصور سے اردو ادب کی اصناف میں سوانح نگاری اور تاریخ نویسی نے خصوصیت کے ساتھ بہت زیادہ اثر قبول کیا۔

ہندوستان میں مغربی تخیل کے پھیلنے سے قبل سوانح نگاری، فارسی اور عربی کے اسلوب کے مطابق تھی، اردو نے چونکہ فارسی اور عربی کے سایہ میں نشو ونما پائی؛ اس لئے قدرتی طور پر اس نے تصورات اور اسالیب بھی انھیں زبانوں سے لئے اور سوانح کی قدیم کتابوں، جن کی تعداد بہت کم ہے، انھیں زبانوں کے طرز اور اسلوب پر لکھی گئیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ عربی لٹریچر تذکرے کی اہم کتابوں سے مالامال ہے اور ان کی اہمیت صرف مواد اور معلومات ہی کے لحاظ سے نہیں، بلکہ اسلوب، دلاویزی اور عمدگی کے نقطۂ نظر سے بھی ہے، مگر اس کے باوجود، موجودہ زمانہ کی

سوانح عمریوں سے مقابلہ کرنا، مضحکہ خیز بات ہوگی، ہمیں اس کے تسلیم کرنے میں تامل نہیں کہ قدیم سوانح عمریوں میں سچائی اور صداقت کا بڑا خیال رکھا جاتا تھا، مگر بتدریج زمانہ کے ساتھ ساتھ اس میں کمی ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ اصلیت، آزادی اور سچائی کے بجائے رسمیت اور تصنع نے رواج پالیا، سچائی اور صداقت کی تلاش و جستجو، محدثین کے تذکروں میں خصوصیت سے بہت ملتی ہے، لیکن ایسی کتابیں اردو اور فارسی مصنفین کے قلم سے بہت کم ہیں، اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آج کل سوانح عمری کا جو مفہوم ہے، اس لحاظ سے اردو لٹریچر سوانح عمریوں سے دور انقلاب سے قبل بالکل خالی تھا اور مغربی اثرات، جس کے پھیلانے میں سرسید کا سب سے بڑا ہاتھ ہے، انھیں وجود میں لائے۔

یہ واقعہ ہے کہ صرف مشرق ہی میں نہیں، بلکہ مغرب میں بھی موجودہ سوانح نگاری اٹھارہویں صدی کے بعد وجود میں آئی، Sir Edmond Gosse کا قول ہے "سوانح حیات انسان کی زندگی کی کیفیتوں کا صحیح عکس ہوتی ہے" چنانچہ بعد میں سچی زندگی اور صحیح واقعات پر زیادہ زور دیا جانے لگا اور ذاتی رجحانات اور اخلاقی مقاصد کو اچھی سوانح نگاری کے لئے مضر سمجھا جانے لگا۔ سوانح نگاری نے ایک علمی حیثیت اختیار کرلی اور جذبات کو اس کا دشمن سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا اور Harold Nicholson

کا یہ قول کہ " تمام جذبات میں، مذہبی غلو صحیح اور سچی سوانح حیات کے لئے سم قاتل ہے " عملاً تسلیم کر لیا گیا۔

موجودہ زمانے میں سوانح نگاری نے ایک اور طریقہ اختیار کر لیا ہے۔ آج کل عام طور پر نفسیات کو ترجیح دیجاتی ہے اور انسان کی شخصیت اور انفرادیت سے دلچسپی روز افزوں بڑھ رہی ہے اور Lytton Stratchey کی موثر شخصیت نے اسے ترقی دے کر سائنس کی شکل دے دی۔

اردو کے اولین سوانح نگار حالی اور شبلی گو انگریزی زبان سے اچھی طرح واقف نہ تھے، لیکن زمانہ حال کی تبدیلیوں اور ترقیوں سے بے خبر نہیں تھے۔ یہ صحیح ہے کہ ان دونوں سوانح نگاروں سے قبل، جنھیں ہم نے اولین سوانح نگار کہا ہے، سرسید نے آنحضرت صلعم کی سیرت پر ایک مختصر سی کتاب لکھی تھی اور مغرب کے اصول اور طرز کو اس میں پوری طرح برتا تھا، لیکن وہ سوانح نگار نہیں تھے اور نہ انھوں نے کبھی اس کا دعویٰ کیا۔

حالی نے حیات سعدی کے دیباچہ میں مغربی سوانح نگاری کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ " زمانہ حال میں یورپ کے مورخوں نے خاص کر سترھویں صدی سے بیوگرفی کو بے انتہا ترقی دی ہے یہاں تک کہ تاریخ کی طرح، بیوگرفی نے بھی فلسفہ کی شکل اختیار کی ہے، حال کی بیوگرفی میں اکثر مورخانہ تدقیق کی جاتی ہے اور

واقعات سے منطقی طور پر نتائج استخراج کئے جاتے ہیں، مصنف کے کلام میں غور وخوض کیا جاتا ہے اور اس کے عیب اور خوبیاں صاف طور پر ظاہر کی جاتی ہیں، اکثر ایک ایک شخص کی لائف کئی کئی ضخیم جلدوں میں لکھی جاتی ہے" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حالی سوانح نگاری کے جدید تصور سے اچھی طرح واقف تھے، مگرچونکہ شبلی کو مغربی علوم وفنون سے استفادہ کے مواقع حالی سے زیادہ حاصل تھے۔ جیسا کہ اس مقالہ کے آخر میں ہم اس سے متعلق عنوان کے ماتحت مفصل بحث کریں گے، اس لئے ان کی سوانح عمریاں زیادہ مکمل اور نسبتاً بہتر ہیں۔

شبلی سے قبل تاریخ کی کتابیں تحقیق سے بالکل خالی تھیں اور جدید ذوق ورجحان کا ان میں مطلق خیال نہیں کیا گیا تھا، یا تو اتنی خشک تھیں کہ کوئی پڑھنے کی ہمت نہ کرسکے یا دلچسپی کا اس قدر سامان بہم پہنچا دیا گیا تھا کہ وہ تاریخ کے پایہ سے گرگئیں۔ مولانا شبلی نے ان تمام نقائص کو دور کیا اور تاریخ کا ایک معیار قایم کیا۔ جدید طرز کے مطابق نئے مباحث پر ــــــ محققانہ، ــــــ اور عالمانہ بحث کرکے مغربی تصانیف کی ہمسری کے قابل بنایا۔ دلچسپی اور شگفتگی اس طرح پیدا کی ہے کہ عوام وخواص دونوں پڑھنے میں کسی قسم کا بار محسوس نہ کریں اور زبان تو بقول سرسید" رشک دلی و لکھنؤ تھی" شبلی کے متعلق اردو کے ایک لایق ادیب اور فاضل نقاد

لکھتے ہیں -

" اردو لٹریچر کے پیدا کرنے والے تھوڑے ہیں ان میں بھی تھوڑے ہی ایسے ہیں، جو آج کل کے وسیع معیار قابلیت کے لحاظ سے اہل قلم کی صف اول میں شامل ہونے کے لائق ہوں، سرسید سے قطع نظر کرنے کے بعد، جن کو باستحقاق اولیت کا فخر حاصل ہے، میرا خیال ہے، شبلیؔ بہ لحاظ فن صرف ہندوستان نہیں بلکہ تمام اسلامی دنیا میں کسی سے دوسرے درجے پر نہیں ہیں، اس کو میری قاصرالنظری یا علمی فرومایگی پر محمول نہ کیجیے۔ فلسفہ تاریخ جو آج کل تمام علوم میں سر فہرست ہے، ایک مستقل فن ہو گیا ہے اور اس قدر اہم ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے فاضل مورخانہ موشگافیوں کو بہترین مشغلہ ہستی سمجھتے ہیں۔ مصری اور ترکی لٹریچر میں تاریخی مذاق جس حد تک موجود ہے، میں اس سے بیگانہ نہیں ہوں، مجھ کو معلوم ہے کہ دونوں زبانیں خاص کر اول الذکر اس قدر مغربیت سے مانوس ہو گئی ہے کہ وہاں کے روشن خیال علما، مغربی طرز تحریر کی خصوصیات کے ساتھ عربی اور ترکی زبانوں کو نہایت شائستگی سے داد سخن دے رہے ہیں،

لیکن جن مضامین پر ان کے ہاں منقولاناً اور معقولاً نہ سرگرمی سے طبع آزمائیاں ہو رہی ہیں، وہ شبلی کے یہاں دست فرسودہ اور مسائل ابتدائی ہیں، جن فاضل مورخ کی سرسری جنبش قلم مدت ہوئی، ایک سے زیادہ موقعوں کے لئے طے کر چکی ہے، ملک کے لئے یہ کچھ کم فخر کی بات نہیں کہ مصر کے مشہور رسالہ "الہلال" کے نامور ایڈیٹر علامہ جرجی زیدان اپنی تاریخ تمدن اسلام میں، جو متعدد جلدوں میں ختم ہوگی، علامہ شبلی کی تحقیقات سے بے نیاز نہ رہ سکا اور اس نے سنداً اقتباسات کئے۔ بہر حال ہم میں صرف شبلی ایسا شخص ہے جو بہ لحاظ جامعیت اور وسیع النظری، مورخانہ تدقیق اور مذاق فن کی حیثیت سے آج یورپ کے بڑے بڑے مورخ سے پہلو بہ پہلو ہو سکتا ہے"(۱)

کارلائل کا مشہور فقرہ ہے کہ "تاریخ عالم صرف اس کے بڑے بڑے اشخاص کی تاریخ کا نام ہے" History to be a connected story of great men
شبلی کے پیش نظر غالباً یہی فقرہ تھا، چنانچہ انھوں نے سب سے پہلے

---

(۱) افادات مہدی صفحہ ۱۰۳

مشاہیر اسلام پر قلم اٹھایا، اس سلسلہ میں پہلی کتاب المامون شائع ہوئی۔ یہ دو حصوں میں ہے، ایک حصہ میں ترتیب خلافت،
مامون الرشید کی تعلیم و تربیت، ولیعہدی، تخت نشینی، خانہ جنگیاں، فتوحات ملکی اور وفات تک کے عام حالات ہیں، دوسرے حصہ میں ان مراتب کی تفصیل ہے، جن سے اس عہد کے ملکی حالات اور مامون الرشید کے اخلاق و عادات کا اندازہ ہو جاتا ہے ونیز ان تمام کارناموں کو تفصیل سے بیان کیا ہے، جن کی وجہ سے مامون کا عہد عموماً شاہان عالم کے عہد سے علمی حیثیت سے ممتاز تسلیم کیا گیا ہے۔ کتاب کے آغاز میں سر سید احمد خاں مرحوم کے قلم سے ایک مختصر سا دیباچہ ہے، جس میں انھوں نے مولف کے طرز تصنیف خصوصاً تاریخ نویسی اور کتاب کی حیثیت پر نہایت خوبی کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"پہلے حصہ میں انھوں نے سلسلہ وار تاریخانہ واقعات لکھے ہیں اور نہایت خوبی اور اختصار سے دکھایا ہے کہ خلافت کا سلسلہ کیونکر اور کیوں خاندان بنو امیہ کو برباد کرکے عباسی خاندان میں پہنچا اور کیا اسباب جمع ہوئے، جس سے امین اس کا بھائی محروم اور مقتول ہوا اور خود مامون تمام مملکت اسلامی کا مالک الملک لاشریک لہ بن گیا۔ جابجا واقعات دلچسپ سے بھی اس حصہ کو آراستہ کیا ہے، جس کے

سبب سے یہ سوکھا اور پھیکا تاریخانہ حصہ نہایت دلچسپ ہو گیا ہے۔

دوسرے حصہ میں انتظام سلطنت، آمدنی سلطنت، فوجی انتظام و عدالت اور اس کی جزئیات کو جہاں جہاں سے ملیں، چن چن کر ایک جگہ جمع کیا ہے اور مامون کی فضیلت اور اس کی سوشل حالت، اس کی پرائیویٹ زندگی اس کے مشغلوں اور اس کی مجلسوں کا ذکر کیا ہے اور اس زمانہ کی زندگی اور طرز معاشرت کا نقشہ کھینچ دیا ہے، یہ حصہ نہایت ہی دلچسپ ہے شان اور عظمت اور جلال خلافت کے ساتھ ایسی ایسی سادہ اور بے تکلف باتوں سے بھرا ہوا ہے کہ اُس سے اُس کو اور اُس کو اِس سے رونق ہوتی ہے اس حصہ میں لطائف و ظرائف کے ساتھ علمی اور خصوصاً علم و ادب کے ایسے ایسے نکتے مذکور ہیں جو ادیب کیلئے سرمایۂ ادب اور ظریف کے لئے سرمایہ ظرافت ہیں۔ یہ کتاب اردو زبان میں لکھی گئی ہے اور ایسی صاف و شستہ اور برجستہ عبارت ہے کہ دلی والوں کو رشک آتا ہوگا۔

اردو زبان نے بہت کچھ ترقی کی ہے، مگر اس بات کا بہت کم لحاظ رکھا گیا ہے کہ ہر فن کے لئے زبان، طرز بیان جداگانہ ہے۔ تاریخ کی کتابوں میں ناول (قصہ) اور

ناول میں تاریخانہ طرز، گو کیسی ہی فصاحت اور بلاغت سے برتا گیا ہو دونوں کو برباد کرتا ہے ....

ہمارے لایق مصنف (شبلی) نے اس کا بہت کچھ خیال رکھا ہے اور باوجود تاریخانہ مضمون ہونے کے، ایسی خوبی سے اس کو ادا کیا ہے کہ عبارت بھی فصیح اور دلچسپ ہے اور تاریخانہ اصلیت بدستور اپنی اصلی حالت پر موجود ہے، جو خوبصورت ہے، خوبصورت ہے، جو بھونڈی ہے، بھونڈی ہے، خوبصورتی کو زیادہ خوبصورت بنایا ہے، نہ بھونڈے پنے کو زیادہ بھونڈا اور درحقیقت یہی کمال تاریخ نویسی کا ہے "

سرسید نے آخری پیرے میں، جو خصوصیت بیان کی ہے وہ محض المامون کی خصوصیت نہیں ہے، بلکہ شبلی کی تمام تاریخی کتابوں میں یہ خصوصیت بہت نمایاں اور ممتاز ہے اور یہی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے شبلی کو ان کے معاصرین میں امتیاز اور فضیلت حاصل ہے
اس کے بعد سیرۃ النعمان شائع ہوئی۔ امام ابوحنیفہ کے اجتہادی مسائل تقریباً بارہ سو برس سے تمام ممالک اسلامی میں پھیلے ہوئے ہیں بڑی عظیم الشان اسلامی سلطنتوں میں انھی کی فقہ رائج ــــــــ تھی اور آج بھی ہے۔ اسلامی دنیا کا غالب حصہ اسی مذہب فقہ کا پیرو ہے، عربی، فارسی، ترکی بلکہ یورپ کی زبانوں میں ان کی

متعدد سوانح عمریاں لکھی گئیں، ظلم تھا اگر ان کے حالات زندگی خود اردو میں نہ لکھے جاتے۔ یہ کتاب بھی دو حصوں میں تقسیم ہے، پہلے حصہ میں مختصر سی تمہید کے بعد قدیم ان کتابوں کی فہرست ہے جو امام ابوحنیفہ کے حالات پر لکھی گئی ہیں، پھر امام کی ولادت اور نسب، تابعیت کی تحقیق، امام کا سن رشد اور تعلیم، ان کے شیوخ حدیث کی تفصیل اور ان کے مختصر تراجم، تعلیم و افتاء حالاتِ زندگی دربار شاہی سے تعلقات، وفات، ان کی اولاد کی تفصیل، ان کے اخلاق و عادات طرز معاشرت اور عام حالات، ان کے مناظرے و فتاوے اور علمی مجلسیں، ان کی شہرت اور ہمعصروں کی ان کی نسبت رائیں وغیرہ ہیں۔ دوسرے حصہ میں تدوین فقہ اور امام صاحب کے طریق اجتہاد پر بحث کی گئی ہے، آخر میں ان کے مشہور شاگردوں کے مختصر حالات بھی ہیں۔

پہلے حصہ میں ظاہر ہے، مولف کو کچھ زیادہ زحمت پیش نہ آئی ہوگی۔ امام صاحب پر ہر زبان میں، جیسا کہ خود مولف نے دیباچہ میں لکھا ہے، متعدد کتابیں موجود ہیں۔ صرف تحقیق و مطالعہ کی ضرورت تھی اور یہ جنس شبلی کے یہاں بہت ارزاں ہے، دوسرے حصہ کی تالیف میں البتہ مؤلف کو اپنی غیر معمولی قابلیت کو کام میں لانا پڑا ہوگا، کیونکہ ان مسائل سے، جو دوسرے حصہ میں بیان ہوئے ہیں، قدیم کتابیں یکسر خالی ہیں، اس منزل میں مؤلف کو خود ہی

رہرو اور خود ہی رہنما بننا پڑا ہوگا۔

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ

اور یہ حصہ حقیقت میں مولانا کی کوششوں اور محنتوں کا بہ الفاظ خود "تماشا گاہ" ہے۔

جس زمانہ میں مولانا کو ہیروز آف اسلام کا خیال پیدا ہوا تھا، اسی وقت یہ خیال بھی آیا تھا کہ ہندوستان میں جس قدر تاریخی سرمایہ موجود ہے وہ اس مقصد کے لئے کسی طرح کافی نہیں ہو سکتا اس لئے مصر و روم کے سفر کا خیال پیدا ہوا، حالات جونہی مساعد ہوئے، مولانا سفر پر روانہ ہو گئے، واپسی پر سفرنامہ روم و مصر و شام کے نام سے ایک کتاب ترتیب دی، جس میں قسطنطنیہ، بیروت اور بیت المقدس و قاہرہ کے عام اجمالی حالات، قابل دید اور تاریخی مقامات، مشہور عمارتیں، سر رشتہ تعلیم، دار العلوم اور مدارس، دار الاقامہ کی زندگی، عام طلبہ کی تعلیم و تربیت، تعلیم نسواں، اہل قلم، کتب خانے، اخبارات و رسائل، مشہور بادشاہوں اور ارباب کمال سے ملاقات ترکوں اور عربوں کے اخلاق و عادات وغیرہ تفصیل سے لکھے ہیں اور آخر میں جدید عربی الفاظ کی مختصر سی فرہنگ بھی دی ہے۔

تمہید میں مؤلف نے بتلایا ہے کہ "اس کتاب کو پڑھ کر ناظرین کے دل میں ترکوں کی تہذیب و شائستگی کا جو درجہ قائم ہوگا، وہ اس سے مختلف ہوگا جو یورپ کے عام لٹریچر سے ظاہر ہوتا ہے"

موصوف نے یورپین مصنفین کے عام تعصب کا بھی ذکر کیا ہے اور ترکی کے ان سفرناموں کی غلطیوں کے اسباب بھی لکھے ہیں، جو یورپ کی تاریخی تصانیف کا سرمایہ ہیں اور جن کی بنیاد پر یورپین مورخین اپنی تحقیقات کی عمارت کھڑی کرتے ہیں۔

اس کے بعد مولانا نے الفاروق کی تالیف و تربیت کی طرف توجہ کی، جو نہ صرف ان کی تصانیف میں گل سرسبد کی حیثیت رکھتی ہے، بلکہ اردو زبان کے لئے سرمایۂ فخر و ناز ہے، اگر الفاروق کے علاوہ مولانا ایک کتاب بھی نہ لکھتے، جب بھی وہ ہندوستان کے سب سے بڑے مورخ اور محقق کہلاتے، اسے خصوصا دوسرے حصہ کو پڑھنے کے بعد، مولانا کے عمیق اور وسیع مطالعہ کے علاوہ، غیر معمولی دل و دماغ کی بھی داد دینی پڑتی ہے۔ مولانا نے ان مسائل پر بحث کی ہے اور پورے عالمانہ اور مورخانہ انداز میں، جنھیں آج بھی چھیڑتے ہوئے ہمارے مورخین کے قلم میں رعشہ پیدا ہو جاتا ہے اور ان کے قلم کی سیاہی خشک ہو جاتی ہے۔

مسلمانوں نے ایک عرصے تک معمورۂ ارضی کے ایک بڑے حصہ پر نہایت شاندار اور عظیم الشان حکومت کی ہے، ان کا طریق حکومت اور ان کا معاشی اور اقتصادی نظام اس قدر کامیاب رہ چکا ہے کہ ان بدلے ہوئے حالات میں بھی، جدید ترقی و تمدن

اور صنعتی انقلاب کی وجہ سے جو مشکلات پیدا ہو گئی ہیں، بہت کچھ اس سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ اس دور کی جب کبھی بھی کوئی معاشی اور اقتصادی تاریخ لکھی جائے گی، مرتب الفاروق سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ الفاروق کے متعلق ملک کے ایک ممتاز اہل قلم کی رائے ہے۔

"یہ عمروں کی کمائی ہے، بڑی کاوش و اہتمام سے، سالہا سال کی مورخانہ تلاش اور تدقیق کے بعد نامورانِ اسلام کے سلسلہ میں خلیفۂ دوم (حضرت عمرؓ) کی لائف پر یہ ضخیم تالیف تیار کی گئی ہے، مورخ نے محض تحقیق واقعات کے لئے ممالک غیر یعنی ٹرکی اور مصر وغیرہ کے مصائب سفر برداشت کئے، سینکڑوں قدیم و نایاب، تاریخوں کے ہزاروں ورق الٹنے پڑے اور جہاں تک دسترس تھا، اصل ماخذ کی چھان بین میں یورپ کا تاریخی سرمایہ بھی بچنے نہیں پایا۔ غرض معلومات کا جو ذخیرہ جمع کیا گیا ہے، وہ میرے خیال میں تاریخ فاروقی کے مہات مسائل ہیں، جن کی نسبت یہ عام دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ کسی زبان میں اس قدر مواد یکجا نہیں ہو سکتا۔" (۱)

---

(۱) افادات مہدی صفحہ ۴۴

خود مولانا شبلی کو اس کتاب پر بڑا ناز تھا، ایک مشہور مصری مورخ، رفیق بک عظیم نے "اشہر مشاہیر الاسلام" کا سلسلہ، مولانا کے ہیروز آف اسلام (ناموران اسلام) کی طرح شروع کیا تھا اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ کی سیرت شائع ہوئی تھی، اس کے متعلق ترجمان القرآن مولانا حمیدالدین فراہیؒ کو مولانا شبلی اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں "آج کل مصر میں سیرۃ الفاروق لکھی گئی، بڑا اہتمام کیا گیا، مشہور مصنف نے لکھا لیکن دیکھا تو الفاروق کے عشر عشیر بھی نہ تھی" اڈیٹر رسالہ زمانہ (کانپور) کے چند سوالات کے جواب میں ایک جگہ لکھتے ہیں "میں اپنی تصنیفات میں الفاروق کو سب سے زیادہ پسند کرتا ہوں" الفاروق کی غیر معمولی ہر دلعزیزی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ فارسی عربی اور انگریزی میں اس کے ترجمے نہایت مقبولیت حاصل کر چکے ہیں اور یہ ایک ایسا فخر ہے کہ جو اردو کے کسی اور مصنف کو حاصل نہ ہو سکا۔

ان تاریخی کتابوں کے علاوہ جن کا اوپر ذکر ہوا ہے، مولانا کے متعدد تاریخی مضامین بھی ہیں، جو ان کے کارناموں میں شامل کئے جا سکتے ہیں، یہ مضامین گو مختصر ہیں اور کسی مستقل تصنیف کی خوبیاں نہیں رکھتے مگر تحقیق و تفحص اور تلاش و جستجو کے لحاظ سے ان کی حیثیت کسی تصنیف سے کم نہیں ہے۔

مولانا کے چند تاریخی مضامین کا مجموعہ رسائل شبلیؔ کے نام سے ان کی حیات ہی میں شائع ہو گیا تھا، ان مضامین کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جرجی زیدان جیسے مشہور اور نامور مورخ نے ان سے استفادہ کیا۔ چنانچہ مولانا سید سلیمان ندوی نے زیر ترتیب حیاتِ شبلی کے حصہ اول میں ایک جگہ لکھا ہے۔

"مصر کے عیسائی مورخ جرجی زیدان نے تمدن اسلامی کے نام سے چار پانچ جلدوں میں اسلامی تمدن کی تاریخ لکھی ہے، اس کی تیسری جلد علوم و فنون کی تاریخ پر ہے۔ بدگمانی نہیں کرتا، لگر معلوم ہوتا ہے کہ یہی رسائل اس کے سامنے تھے اور انھی کو دیکھ کر اسی رنگ سے روا قعات کے حوالوں کی مدد سے جو رسائل کے حاشیوں پر لکھے ہوئے ہیں اس نے یہ مرقع تیار کیا ہے۔" (۱)

انھیں مضامین میں ایک مضمون کتب خانہ اسکندریہ پر بھی ہے "من جملہ ان افسوسناک غلطیوں کے جو یورپ میں اسلامی تاریخ کے متعلق کسی زمانہ میں پیدا ہو گئی تھیں اور اب تک قایم

---

(۱) مسودہ حیات شبلی

ہیں۔ایک کتب خانہ اسکندریہ کے جلائے جانے کا واقعہ بھی ہے .... اس واقعہ کو یورپ نے جس بلند آہنگی سے مشہور کیا ہے، حقیقت میں وہ نہایت تعجب انگیز ہے' تاریخیں، ناولیں، حکایتیں، مثلیں، افسانے، قصہ طلب حوالے روزمرہ کے محاورے ایک چیز بھی اس صدا سے خالی نہیں ادب اور لٹریچر کا تو کیا ذکر ہے، منطق و فلسفہ بھی اس کے اثر سے محروم نہ رہے" اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود مسلمانوں کو اس کی صحت کا یقین ہو چلا تھا، مگر مولانا شبلی پہلے شخص ہیں جنھوں نے مسلمانوں پر اس الزام کو اور لوگوں کے ذہنوں سے اس غلط فہمی کو دور کیا چنانچہ مولانا عبدالحق صاحب لکھتے ہیں

"طالب علمی کے زمانہ میں، جب میں انگریزی تاریخوں اور دوسری کتابوں میں یورپین مورخوں کا یہ الزام پڑھتا تھا کہ مسلمانوں نے حضرت عمرؓ کے حکم سے اسکندریہ کے بے نظیر کتب خانے کو جلا کر خاک کر دیا تو بے حد رنج اور صدمہ ہوتا تھا، لیکن جب شمس العلماء مولانا شبلی نے ایک محققانہ رسالہ لکھ کر محکم دلائل اور پرزور شہادتوں سے اس کی تردید کی تو اس بے نظیر رسالہ کو پڑھ کر پوری تسکین ہو گئی اور یقین ہو گیا کہ یہ محض فسانہ اور یورپین مورخوں کا

مسلمانوں پر افترا اور بہتان ہے "(۱)

اس مضمون میں مولانا کی تحقیق و تلاش اس طرح نمایاں اور ممتاز ہے، جس طرح ان کی اچھی سے اچھی کتاب میں ہے، عربی کی کتابیں تو مولانا کی نظر میں تھیں ہی، لیکن انگریزی، فرانسیسی اور جرمن تصانیف سے اس کثرت سے، حوالے نقل کئے گئے ہیں اور خود مغربی مصنفین کے اقوال سے اس الزام کا ابطال کیا گیا ہے کہ اس کی مثال اردو کی کوئی کتاب پیش کرنے سے قاصر ہے۔

مولانا کا ایک اور مضمون ان کی تحقیق و تفتیش اور ان کی تنقیدی قوت کے لحاظ سے نہ صرف ان کے مضامین میں بلکہ اردو میں شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے، جرجی زیدان کی کتاب تمدن اسلام کا ابھی ذکر آچکا ہے " اس میں مصنف نے درپردہ مسلمانوں پر نہایت سخت اور متعصبانہ حملے کئے ہیں، لیکن بظاہر مسلمانوں کی مدح سرائی کی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کی نظر اس کی فریب کاریوں پر نہیں پڑی اور کتاب گھر گھر پھیل گئی، مگر مولانا شبلی عقاب کی سی نگاہ رکھتے تھے، ان سے کیوں کر بچ سکتی تھی، انھوں نے ان تمام اعتراضات کی جو

---

(۱) مقدمات عبدالحق حصہ اول صفحہ ۲۰۵

مسلمانوں پر علانیہ یا خفیہ طور پر کئے گئے تھے، مدلل تردید کی اور مصنف کی فریب کاریوں اور خیانتوں کو آشکارا کیا، اصل مضمون عربی میں لکھا گیا تھا، مگر اردو خواں طبقہ کے لئے خود اردو میں بھی منتقل کیا، مگر تمام زور عربی میں صرف ہوچکا تھا، اس لئے وہ تمام خوبیاں اردو میں منتقل نہ ہوسکیں، خود مولانا کے الفاظ میں "طرز تحریر بھی معمولی ہے"۔

اس سلسلہ کی آخری کڑی سیرۃ النبی ہے، یوں تو دنیا کی ہر زبان میں آنحضرت صلعم کے حالات اور ان کی تعلیمات پر کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن اس عظیم الشان تالیف کی نظیر نہ تو عربی زبان، باوجود اپنی قدامت اور باوجود اپنی اس خصوصیت کے کہ رسول صلعم اور قرآن حکیم کی زبان ہے، پیش کرسکتی ہے اور نہ فارسی یا دنیا کی کوئی اور ترقی یافتہ سے ترقی یافتہ زبان۔ اسی وجہ سے اسے عربی اور بعض دوسری زبانوں میں منتقل کیا جارہا ہے۔

اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مستشرقین یورپ، اسلامی علوم وفنون کی ریسرچ میں مسلمانوں سے کہیں زیادہ کام کررہے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ اس عناد و دشمنی کی بناپر جو انھیں اسلام اور مسلمانوں سے ہے یا عربی علوم وفنون پر پوری دسترس نہ رکھنے کی بناپر ان کی تحقیقات، عام طور پر

بے شمار اور فاش غلطیوں سے پر ہوتی ہیں، عموماً غلط واقعات نقل کرتے ہیں، صحیح اور موضوع روایات میں امتیاز نہیں کرسکتے اور استنتاج تو بلا مبالغہ ۵۰ فی صدی غلط کرتے ہیں۔ آنحضرت صلعم کی سیرت کو خصوصاً مستشرقین نے جس طرح پیش کیا ہے، وہ مسلمانوں کے لئے ہمیشہ تکلیف دہ رہا ہے، اس لئے ایک ایسی سیرت کی ضرورت تھی، جس میں آنحضرت صلعم اور ان کی تعلیمات کو دنیا کے سامنے صحیح شکل میں پیش کیا جائے اور ان اعتراضات کے مدلل جوابات دیئے جائیں، جو عام مستشرقین یورپ آنحضرت صلعم اور بعض غزوات پر کرتے ہیں، مگر تھا یہ بہت مشکل کام، کسی ایسے شخص کی ضرورت تھی جس کی نگاہوں سے عربی اور مشرقی زبانوں کی وہ تمام کتابیں گزر چکی ہوں، جو یا تو مستشرقین یورپ کی کتابوں کا ترجمہ ہوں یا خود مسلمانوں کی لکھی ہوئی ہوں، ان کے علاوہ انگریزی اور فرانسیسی کی ان کتابوں پر بھی عبور حاصل کرسکے، جو آنحضرت صلعم کے متعلق، مخالفت یا موافقت میں لکھی گئی ہیں۔ شبلی ہی کی ایک ایسی ذات تھی جو ان مشکلات پر قابو حاصل کرسکتی تھی اور اس کام کو باحسن طریقہ پر انجام دے سکتی تھی، چنانچہ انھوں نے اس کے لکھنے کا عزم کیا اور تمام کاموں سے کٹ کر اس کے ہو کر رہ گئے۔ گو اس سلسلہ کو وہ اپنی حیات میں مکمل نہ کرسکے، لیکن ایسا مکمل خاکہ تیار کر گئے ہیں کہ ان کے اخلاف ان کے منشا کے مطابق

اس کی نگیں میں لگے ہوئے ہیں۔

علم کلام

مولانا نے اپنے لائحہ عمل میں، جدید ضروریات کے پیش نظر، علم کلام کو فلسفہ جدید کے مقابلہ میں مرتب کرنے کی ضرورت ظاہر کی تھی، جس طرح دولت عباسیہ میں علم کلام کی بنیاد کی ضرورت پیش آئی، ٹھیک اسی طرح جدید فلسفہ کے شیوع کے بعد علم کلام کی جدید ترتیب و تبویب کی ضرورت تھی، ظاہر ہے اس کام کو شبلی کے علاوہ کون انجام دے سکتا تھا، اس لئے مولانا نے ایک مبسوط تاریخ لکھنے کے لئے قلم اٹھایا اور اس کے چار حصے قرار دئے۔

۱۔ علم کلام کی ابتدا، اس کی مختلف شاخیں، عہد بعہد کی تبدیلیاں اور ترقیاں۔

۲۔ علم کلام نے اثبات عقائد اور ابطال فلسفہ کے متعلق کیا کیا؟ اور کس حد تک کامیابی حاصل کی؟

۳۔ ائمہ علم کلام کی سوانح عمریاں۔

۴۔ جدید علم کلام

اس سلسلہ میں مولانا نے الکلام، علم الکلام، غزالی اور سوانح مولانا روم، کل چار کتابیں لکھیں علم کلام کی فہرست میں

سوانح مولانا روم کو دیکھ کر ممکن ہے بعض لوگوں کو تعجب ہو اور مستعجل طبیعتیں ممکن ہے، اعتراض بھی کر بیٹھیں، خود مولف کو بھی اس کا خدشہ تھا، اس لئے انھوں نے اس کی وضاحت کر دی تھی کہ "مولانا روم کو دنیا جس حیثیت سے جانتی ہے وہ فقر و تصوف ہے اور اس لحاظ سے متکلمین کے سلسلہ میں ان کو داخل کرنا اور اس حیثیت سے ان کی سوانح عمری لکھنا لوگوں کو موجب تعجب ہوگا لیکن ہمارے نزدیک اصلی علم کلام یہی ہے کہ اسلام کے عقائد کی اس طرح تشریح کی جائے اور اس کے حقائق و معارف اس طرح بتائے جائیں کہ خود بخود دل نشین ہو جائیں۔ مولانا نے جس خوبی سے اس فرض کو ادا کیا ہے، مشکل سے اس کی نظیر مل سکتی ہے، اس لئے ان کو زمرۂ متکلمین سے خارج کرنا سخت ناانصافی ہے"

الکلام اور علم الکلام لکھ کر جہاں شبلی نے اردو زبان کو ایک نئے علم سے روشناس کیا اور اس کے لٹریچر میں بیش بہا اضافہ کیا، وہاں مذہب کی بھی بہت بڑی خدمت انجام دی، الکلام اور علم الکلام کے لکھنے کی ضرورت صرف اس لئے پیش آئی تھی کہ مغربی علوم و فنون اور جدید فلسفے کے شیوع سے لوگوں کے خیالات و عقائد میں تزلزل پیدا ہو گیا تھا، سائنس کے ماننے کے لئے مذہب سے انکار ضروری سمجھ لیا گیا تھا اور سائنس کا ہر طالب سدا اور مذہب سے اتنا ہی بیر رکھتا تھا، جتنا آج کل بعض نام نہاد کمیونسٹ

رکھتے ہیں، چاہے وہ کمیونزم کی ابجد سے بھی واقف نہ ہوں،
غرض یہ کہ جدید علوم و فنون کو حاصل کرنے سے، جہاں اور بہت سے
فیشن سوسائٹی کے لئے ضروری ہو گئے تھے، وہاں ایک مذہب
سے انکار بھی تھا۔ لوگوں نے اس صورت حال کے مقابلہ کے لئے
علم کلام کی تدوین کی ضرورت محسوس کی، مگر شبلی نے قدیم علم کلام
کو بالکل کافی سمجھا، ضرورت صرف اس بات کی تھی کہ اس کی ترتیب
و تدوین کے وقت جدید حالات اور بدلے ہوئے زمانے کو پیش نظر
رکھا جائے، ساتھ ہی ساتھ انتہائی احتیاط کی بھی ضرورت تھی،
مذہب کی حمایت اس طرح کرنی تھی کہ سائنس اور جدید فلسفہ کا
دامن بھی نہ چھوٹے۔ ظاہر ہے یہ کام کس قدر مشکل تھا، مگر شبلی نے
اسے انجام دیا اور اس خوبی سے انجام دیا کہ بقول مہدی حسن
"ایک طرف تو بڑے میاں نے مذہب کی پگڑی نہیں اتاری اور
ساتھ ہی یورپ کے نوخیز چلتے پرزوں یعنی فلسفہ اور سائنس کے
سامنے تیرہ سو برس کے بوڑھے سے ہاتھ نہیں جڑوائے بلکہ دونوں
میں مصافحہ کروا دیا"

علم الکلام میں مسلمانوں کے علم کلام کی تاریخ، اس کی عہد بہ عہد
ترقی اور علمائے متکلمین کے نظریات بیان ہوئے ہیں اور الکلام
میں عقلی دلائل سے مذہب کو فلسفہ کے مقابلہ میں ثابت کیا گیا ہے
ملاحدہ اور منکرین مذہب کے دلائل کا ابطال اور عقائد و اصول

اسلامی کی فلسفیانہ تشریح و توضیح کی گئی ہے۔

تنقیدات ادب

مولانا حالی نے مقدمہ شعر و شاعری لکھ کر اردو ادب و زبان میں تنقید ادب کا سنگ بنیاد رکھا، اس میں شبہہ نہیں کہ مقدمہ میں نقائص بھی ہیں، لیکن اس لحاظ سے یہ مقدمہ نہایت قابل قدر ہے کہ یہ اردو زبان میں تنقید نگاری کی اولین کوشش ہے۔ فاضل مصنف کے پیش نظر غالباً کوئی مستقل تصنیف نہیں تھی، انھوں نے اپنے دیوان کے لئے صرف مقدمہ کے طور پر لکھا تھا، شاعری کے متعلق ان کے مخصوص خیالات تھے، شاعری کی کنہہ وحقیقت پر عربی کی کتابیں بھی ان کی نگاہ سے گزری تھیں، اس لئے انھوں نے اس مقدمہ میں شاعری کی اصلیت وحقیقت اور اپنے ان خیالات کو، جنھیں انھوں نے عملاً پنجاب کے مشاعرہ سے ظاہر کرنا شروع کیا تھا، تفصیل سے پیش کیا۔ اس میں ایک مستقل تصنیف کی خوبیاں ڈھونڈھنا مصنف پر ظلم کرتا ہے۔

مولانا حالی کا مقدمہ اس زمانہ کے علم وادب کو دیکھتے ہوئے بہت کچھ تھا، مگر ایک ترقی پذیر زبان کے لئے کسی طرح کفایت نہیں کر سکتا تھا شبلی نے موازنہ انیس و دبیر، شعرالعجم اور دوسرے ادبی و تنقیدی مضامین مثلاً شعرالعرب وغیرہ لکھ کر اردو کے لٹریچر کو ایک

صدی آگے بڑھا دیا۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ابھی تک موازنہ اور شعرالعجم جیسی کتابوں سے اردو کا دامن خالی ہے اور ایک عرصہ تک اس پایہ کی کتاب کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ شبلی کی ان کتابوں کے پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ انھیں قدرت کی طرف سے تنقیدی صلاحیت نہایت فیاضی سے عطا ہوئی تھی، اگر وہ ان کتابوں کو نہ لکھتے تو نہ صرف اردو پر بلکہ اپنے پر بھی ظلم کرتے۔ شبلی جیسی جامعیت رکھنے والے اردو میں بہت کم پیدا ہوئے اور ان میں بھی بہت کم ایسے تھے جنھوں نے اپنی صلاحیت اور استعداد سے پوری طرح اردو کی خدمت کی۔

مولانا نے شعرالعجم سے قبل موازنہ لکھا۔ اس کے مطالعہ سے مولانا کے ذوق سلیم، قوت انتخاب اور اصابت رائے کو تسلیم کرنا پڑتا ہے، اس کی اشاعت پر بعض گوشوں سے اس کے خلاف صدائیں بلند ہوئیں اور اس کے جواب میں المیزان لکھی گئی، مگر یہ تمام اعتراضات وقتی ثابت ہوئے اور موازنہ کو حیات جاوید حاصل ہوئی اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ

پرانی ہو کے اب اس کی لطافت بڑھتی جاتی ہے

کتاب کے آغاز میں مرثیہ گوئی پر ایک تاریخی نظر ڈالی گئی ہے گو یہ مختصر ہے، لیکن جو کچھ لکھا گیا ہے، آشنائے فن ہو کر اور اس کے مطالعہ سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کا لکھنے والا عرب و عجم کے لٹریچر

پر کس قدر عبور رکھتا ہے۔

شعر العجم کے متعلق کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ بقول رام بابو سکسینہ "زمانہ حال کی کوئی ایسی تصنیف دیکھنا ہو، جو وسعت مطالعہ اور تحقیق کے ساتھ فصاحت و بلاغت اور سلاست زبان کا ایک بہترین مجموعہ کہی جاسکے تو اس کو شعر العجم دیکھنا چاہئے، جس کی یکتائی پر پروفیسر براؤن ایسے مشہور زمانہ مستشرق کی شہادت موجود ہے"

شعر العجم جیسی کتاب نہ اردو میں ہے اور نہ یورپ کی کسی زبان میں، جہاں تک شعرائے ایران کے تذکروں اور ان کے حالات کا تعلق ہے، وہ ہر زبان میں پورے بسط و تفصیل سے موجود ہیں لیکن جو چیز شعر العجم کو دوسری تمام کتابوں پر ترجیح دیتی ہے وہ اسکی تنقید و تبصرہ ہے۔ شیخ عبدالقادر صاحب پروفیسر دکن کالج پونہ شعر العجم کا انگریزی میں ترجمہ کرنا چاہتے تھے تاکہ پروفیسر براؤن اپنی مشہور کتاب "تاریخ ادبیات ایران Literary history of Persia کی تصنیف میں اس سے مدد لے سکیں، اس پر مولانا شبلی نے انھیں لکھا۔

"شعر العجم کا ترجمہ آپ کریں یہ شعر العجم کی قسمت! لیکن مشکل یہ ہے کہ حالات تو یورپین بھی لکھ چکے ہیں، جو چیز اصل ہے وہ شعرار کے کلام پر ریویو ہے، جس میں اصل اشعار کو نقل کرنا پڑتا ہے، اگر آپ اس کی کوئی ترکیب کر سکیں

تو اس سے کیا بہتر!"

انھیں کو ایک اور خط میں لکھتے ہیں۔

"شعر العجم کا چوتھا حصہ قریباً تیار ہے، اس کا ترجمہ انگریزی میں ہو، تو البتہ یورپ کو نظر آئے کہ کیا چیز ہے۔"

شعر العجم کی یہی خصوصیات ہیں، جنھوں نے اسے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ بیرون ہند مقبول اور ہر دلعزیز بنایا۔ ایک طرف تو وہ پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیات ایران کا آخری ماخذ بنی اور دوسری طرف خود ایران میں اس کا پانچواں حصہ، جو مولانا کی تحقیقات کا نچوڑ ہے، فارسی میں ترجمہ ہو کر مقبول ہوا۔ Urdu prose کے مصنف نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ

"شعر العجم آزاد کی سخندان فارس اور براؤن کی تاریخ ادبیات ایران سے کہیں زیادہ وسیع، تنقیدی اور جامع ہے۔ بلاشبہ براؤن کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ فارسی شاعری کی خوبی اور اس کی صحیح روح کی تعریف کر سکے، کیونکہ وہ مغربی دل و دماغ رکھتا تھا اور مشرقی چیزوں کو ایک مخصوص نقطہ نگاہ سے دیکھنے کا عادی تھا، تاہم اپنی دو آخری جلدوں میں شعر العجم سے اقتباسات نقل کر کے شعر العجم کی غیر معمولی خوبی کا اعتراف کیا ہے اور شبلی کو خراج تحسین دیا ہے، یہ ایک ایسا اعزاز ہے، جو ہندوستان

کے کسی اور محقق کو حاصل نہ ہو سکا "(۱)

مولوی محمود خاں صاحب شیرانی نے شعر العجم پر مبسوط تنقید کی ہے اور اس میں نقائص دکھلانے کی کوشش کی ہے، لیکن انھیں بھی تسلیم کرنا پڑا ہے کہ " فارسی نظم کی تاریخ و تنقید پر، فارسی اور اردو میں اب تک جس قدر کتابیں لکھی گئی ہیں، شعر العجم ان میں بغیر کسی استثنا کے بہترین تالیف مانی جا سکتی ہے۔ "(۲)

شیرانی صاحب کے ان تنقیدی مضامین کو جو رسالہ اردو میں شائع ہوئے تھے۔ انجمن ترقی اردو نے " تنقید شعر العجم " کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس پر ندوۃ المصنفین کے رسالہ " برہان " نے، جو چند علماء دیوبند کے اہتمام و ادارت میں نکلتا ہے اور جس کو شبلی اسکول سے ظاہر ہے کوئی تعلق نہیں، تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے :-

" لیکن اس موقع پر ہم اس افسوس کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ پروفیسر شیرانی کا قلم کئی جگہ غیر محتاط ہو گیا ہے اور انھوں نے مولانا شبلی کی نسبت ایسے طنزیہ فقرے لکھ دئے ہیں جو اس سنجیدہ اور علمی تنقید کی پیشانی پر بدنما داغ معلوم ہوتے ہیں۔ انجمن کا فرض تھا کہ تنقید کو کتاب کی شکل میں شائع کرتے وقت ان فقروں اور جملوں کو جن سے یک گونہ " ذاتی پرخاش " کی بو

---

(۱) Urdu prose صفحہ ۱۴۶ - (۲) اردو، اکتوبر ۱۹۲۲ء صفحہ ۳۰۲

آتی تھی حذف کر دیتی۔ پھر بعض جگہ یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ شیرانی صاحب خواہ مخواہ ہی مولانا شبلی کے سر ہو گئے ہیں اور ان پر نکتہ چینی کر رہے ہیں۔ مثلاً مولانا شبلی نے عام روایات (جن کا اقرار خود شیرانی صاحب کو بھی ہے) کے تتبع میں سلطان سنجر کا انوری کے گھر آنے کا قصہ لکھا ہے شیرانی صاحب سنجر اور انوری کے تعلقات کی مخصوص نوعیت کے اعتبار سے اس کو بعید از قیاس قرار دیتے ہیں حالانکہ ہمارے نزدیک صحیح بیان مولانا شبلی کا ہی ہے۔ چنانچہ اشعار ذیل سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔

نزولِ مصطفیٰ نزدیک بو او بسا نصاری ۔۔۔ نزولت را نبرد من مثل دانی چہ بی آرم
کہ رخت کبریا ہرگز بچوناں کلبۂ آری ۔۔۔ ترا لطفِ تو داعی بود گرنہ کس روا دارد

پروفیسر صاحب نے اس قصیدہ کے صرف شروع کے دو شعر لکھے ہیں اور انداز خطاب سے قیاس کیا ہے کہ انوری کے ہاں سنجر نہیں بلکہ کوئی وزیر آیا تھا۔ حالانکہ "مجیر دولت و دیں" وزیر کی طرح بادشاہ کو بھی کہا جا سکتا ہے۔

پھر یہ نہ بھولنا چاہئے کہ یہ تنقید مولانا شبلی کی فضیلت علمی کو کسی طرح کم نہیں کرتی ہے مولانا کا اصل شاہکار شعرالعجم کا چوتھا اور پانچواں حصہ ہے جس میں انھوں نے فارسی شاعری کے تمام اصناف پر نہایت محققانہ اور بلند پایہ

تبصرہ کیا ہے اور جس سے مولانا کی جامعیت، دقت نظر
بلندی ذوق، فارسی زبان کے مذاق صحیح اور قوت بیان
دانشار پردازی کا اندازہ ہوتا ہے اور ہمارے نزدیک
مولانا کا اصل جوہر یہی ہے ان کا اصل مقصد تذکرۃ الشعراء
لکھنا نہیں تھا۔ تنقید کی علمی عظمت دافادیت کا اعتراف ہر
شخص کے لئے ناگزیر ہے لیکن یہ حقیقت بھی ناقابل تردید
ہے کہ شبلیؔ علم و ادب کے جن جن میدانوں سے ایک
شہسوار کی طرح فاتحانہ انداز میں گزر جاتے ہیں ان میں
سے بہتیرے میدان ہیں کہ شیرانیؔ ان میں قدم بھی نہیں
رکھ سکتے۔"
(فروری ۱۹۴۴ء صفحہ ۱۶۰)

مکاتیب

مولانا کے ادبی کارناموں میں ان کے خطوط کو بڑی اہمیت
حاصل ہے۔

عام تصانیف اور مضامین میں تصنع ہوتا ہے، آمد نہیں
آورد ہوتی ہے اور لکھنے والے کے اصلی جذبات موٹی سی تہہ میں
چھپے ہوتے ہیں، لیکن خطوط میں، جن کے متعلق خیال ہوتا ہے کہ وہ
صرف مکتوب الیہ ہی کی نظر سے گزریں گے، انسان اپنے اصلی
جذبات و احساسات کو ظاہر کر دیتا ہے اور اس طرح غیر محسوس

طور پر اس کا روزنامچہ زندگی مرتب ہوتا رہتا ہے۔ علاوہ ازیں چونکہ اس میں بے ساختہ پن اور آمد سخن ہوتی ہے اس لئے اس میں ادبیت بھی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ مولانا عبدالحق صاحب نے خطوط شبلی کے مقدمہ میں لکھا ہے :-

"خانگی خطوں میں اور خاص کر ان خطوں میں جو اپنے عزیز اور مخلص دوستوں کو لکھے جاتے ہیں، ایک خاص دلچسپی ہوتی ہے۔ تکلف کا پردہ بالکل اٹھ جاتا ہے اور مصلحت کی دراندازی کا کھٹکا نہیں رہتا۔ گویا انسان اپنے سے خود باتیں کر رہا ہے، جہاں اندیشہ لازم نہیں ہے۔ یہ دلی خیالات وجذبات کا روزنامچہ اور اسرار حیات کا صحیفہ ہے، پھر کون ہے، جو اس خاموش آواز کو سننے کا مشتاق نہ ہوگا؟ ہماری فطرت میں ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم روزنامچوں، آپ بیتیوں اور خطوں کو بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔ ان میں وہ صداقت اور خلوص ہے، جو دوسرے کلام میں نظر نہیں آتا۔ یہاں انسان بچپن کی سی سادگی سے بلا تصنع ان خیالات کو بیان کرتا ہے جو اس کے دل و دماغ میں گزرتے ہیں، جنھیں نہ انشا کی صنعت مسخ کرسکتی ہے اور نہ تشبیہات واستعارات کا بوجھ دبا سکتا ہے، گویا وہ کاغذ کے صفحے پر اپنا دل اور

دماغ کھول کر رکھ دیتا ہے، جس میں ہر حرکت، ہر خیال اور
ہر تمنا جیتی جاگتی اور گھٹتی بڑھتی نظر آتی ہے۔"

مکتوبات حالی کے مقدمہ میں فرماتے ہیں۔

"خطوط کی یہی سادگی اور بے ریائی ہے جو دلوں کو لبھا
لیتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ خطوں سے انسان کی سیرت کا
جیسا اندازہ ہوتا ہے وہ کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں ہو سکتا
خطوط میں کاتب، مکتوب الیہ سے، بلکہ اکثر اوقات اپنے
آپ سے باتیں کرنے لگتا ہے، جو خیال جس طرح اس کے
دل میں ہوتا ہے، اسی طرح قلم سے ٹپک پڑتا ہے، نہیں
بلکہ وہ اپنا دل کاغذ کے ٹکڑے پر نکال کر رکھ دیتا ہے
اور اگر وہ دل ایسا ہو، جو سراسر درد سے لبریز ہو،
جس میں ہمدردیٔ بنی نوع انسان کوٹ کوٹ کر بھری ہو،
جو پریم کے رس سے سینچا گیا ہو، تو بتاؤ کہ اس دل کی
تراوش کیسی ہوگی۔"

آل احمد صاحب سرور نے مکاتیب مہدی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے

"خطوط نثر کے دوسرے اصناف سے ذرا مختلف
ہیں کتاب سب کے لئے لکھی جاتی ہے، خط صرف ایک
کے لئے، کتابوں میں جان ہوتی ہے۔ اِدھر چھپیں اُدھر
زمانے کی دست سے محفوظ ہوگئیں۔ لیکن خطوط کے لکھتے وقت

اگر اشاعت کا خیال ہو، تو ان کی ساری نزاکت ولطافت
جاتی رہتی ہے، ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ بے تکلف
خطوط ہوں، دلی جذبات کا آئینہ ہوں، ان میں تصنع
کا شائبہ نہ ہو، لکھنے والے کے چہرے پر نقاب نہ ہو
مکتوب نویس کا آرٹ کیا ہے ؟ صرف فطری ہونا،
جہاں بناوٹ آئی، خط خط نہ رہا، مضمون ہوگیا، خط
وہ نہیں ہے جس میں فصاحت ولطافت کے دریا بہائے
جائیں، بلکہ اچھا خط وہ ہے، جس میں لکھنے والا اپنے
مخاطب سے باتیں کرتا ہوا نظر آئے، اور جس میں اس
کی سیرت کا حقیقی عکس ہو، غالب اس گر سے واقف
تھے، جبھی تو وہ زبان قلم سے باتیں کرتے اور ہجر میں
وصال کے مزے لیتے تھے "

ادب کی یہ صنف (یعنی خطوط نویسی) اردو زبان میں غالب
سے شروع ہوئی اور ان کی خداداد جودت نے ان کی تحریر
میں وہ حسن پیدا کیا کہ آج تک اس کا جواب ممکن نہ ہو سکا۔ غالب
پہلے شخص ہیں، جنھوں نے خطوط میں القاب وآداب کا فرسودہ
اور فضول طریقہ اختیار کرنے سے احتراز کیا۔ پنج آہنگ، میں
لکھتے ہیں "خطوط نویسی میں میرا طریقہ یہ ہے کہ جب خط لکھنے
کے لئے قلم دکاغذ اٹھاتا ہوں، تو مکتوب الیہ کو کسی ایسے لفظ

سے جو اس کی حالت کے موافق ہوتا ہے، پکارتا ہوں اور اس کے بعد ہی مطلب شروع کر دیتا ہوں، القاب و آداب کا پرانا طریقہ اور شکر و شکوہ شادی و غم کا قدیم رویہ میں نے بالکل اٹھا دیا"

غالب نے خطوط میں مکالمہ کا طریقہ ایجاد کیا اور جیسا کہ سرور صاحب نے لکھا ہے "زبان قلم سے باتیں کرتے اور ہجر میں وصال کے مزے لیتے تھے۔ مگر یہ اسلوب رواج نہ پا سکا اس میں شبہ نہیں کہ اسے پسند بہت کیا گیا، مگر غالب کے علاوہ کسی اور نے اس طرز کو اختیار نہیں کیا، صرف شبلی کے ہزاروں خطوط میں ایک خط ایسا ہے، جو مکالمہ کے طرز پر لکھا گیا ہے اور وہ یہ ہے:-

"بھئی کچھ سنا؟"

محمد سمیع۔ خیر تو ہے!

"ہاں ایک تازہ واقعہ ہے، میاں شبلی کا انتقال ہو گیا"

محمد سمیع ارے! سچ؟!! نہیں جھوٹ ہوگا، ابھی ہفتہ بھی نہیں ہوا، ان کا ایک خط میرے نام آیا تھا۔

مولوی محمد عمر صاحب۔ تم نے آج سنا ہے، ابھی اس کو تو

کئی دن ہوئے، انھوں نے جو کتابیں
بھیجی تھیں اس کی رسید بھی تو میں نے
اسی وجہ سے نہیں دی۔

محمد سمیع۔ انا للہ! افسوس! ابھی مرنے کے کوئی
دن تھے۔

حمید۔ ہاں واقعی سخت رنج ہے، مگر تقدیر
سے کس کا زور چلتا ہے (اور دبی
زبان سے) ارے میاں چلو قصہ پاک
ہوا، آئے دن کی حکومتوں سے دم
ناک میں آگیا، بھلا روئداد تو خیر
ایک بار کا کام تھا، لکھ بھی لیا) روز
مدرسہ میں لڑکوں کو مسودہ لکھاتے پھرو
اس پر طرہ یہ کہ ہفتہ وار مدرسہ کی رپورٹ
لکھ کر ان کے پاس بھیجتے رہو، اچھی خاصی
بیگار بھگتا کرو۔

عبدالغفور۔ ارے میاں! خیر مرنا تو سب کے لئے
ہے، ہاں ان کے خط کا جواب رہ گیا
مگر یہ بھی کوئی زبردستی ہے، جی نہ
چاہے تو مفت کی محنت کون گوارہ کرے

حافظ علی حسن صاحب! لو اب کی ان کو خط لکھتے لکھتے رہ گیا۔
استحان کا حال لکھنا تھا اور جو کچھ ہو،
آدمی تو مزے کا تھا، دو گھڑی کیفیت
رہتی تھی۔

مولوی محمد عمر صاحب! بھئی! کیا کہئے، دل لگی ہی جاتی رہی
اور تو کس کام کا آدمی تھا، مگر ہاں
جی بہل جایا کرتا تھا،

مولوی احمد اللہ۔ اجی! جی کیا بہلتا تھا، دنیا بھر کی
شکائتیں ہوا کرتی تھیں، کبھی ان کی
نقل کی، کبھی ان کا خاکہ اڑایا اور
اس کے سوا ان کا کام ہی کیا تھا، چلو
اچھا ہوا۔ یار خوش قسمتی سے ایسے
ایسے عزیز احباب ہاتھ آئے ہیں۔

لوگ کہیں گے کہ کیا حماقت کی ہے۔ مگر خدا کی
قسم دل کی چوٹ اور حضرات کی عنایات کا پورا
تجربہ ہے، تمہیں انصاف کرو، خط لکھنا کم بخت کون سا
کام ہے مگر یہ بھی نہیں ہو سکتا" (۱)

---

(۱) مکاتیب شبلی حصہ اول صفحہ ۶۷

مولانا شبلی اپنے معاصرین میں سب سے بڑے انشاپرداز تھے، اس لئے قدرتی طور پر ان کے خطوط میں بڑی ادبیت ہے مہدی حسن، خود مولانا کو لکھتے ہیں "آپ کے لایق ادب کارڈ بھی اس قدر جامع و مانع ہوتے ہیں، جیسے چنے کی دال پر قل ہواللہ لکھی ہو...... آپ دو سطریں بھی ایسی نہیں لکھ سکتے، جس میں چشم سخن کسی نہ کسی لٹریری مسئلہ کی طرف اشارے نہ کرتی جائے اور یہ انشاپردازی کا کمال ہے، آج ملک میں آپ کے سوا کون ہے، جو کم سے کم میری توقعات کو پوری کر سکتا ہو"(۱) اپنے ایک دوست کو لکھتے ہیں۔

"مکاتیب شبلی دراصل دیکھنے کی چیز ہے، سچ یہ ہے کہ اس علم کے پتلے کا کوئی رونگٹا بے کار نہیں، خط لٹریچر کا ایک عنصر ہے، جس میں لکھنے والے کے اہتمام کو چنداں دخل نہیں ہوتا، یعنی وہ یہ نہیں جانتا کہ کبھی اس کی اشاعت کی نوبت آئے گی اس لئے سرسری اظہار خیال بھی اس پایہ کا ہو کہ انشاپردازی اس کی بلائیں لیتی ہو، تو یہ بھی کمال کا ایسا رخ ہے، جس سے قطع نظر نہیں کی جا سکتی"(۲)

---

(۱) مکاتیب مہدی صفحہ ۵ (۲) ایضاً صفحہ ۱۸۵

اس کے برعکس مولانا شبلی کے معاصرین کے خطوط عام طور پر نہایت پھیکے اور ادبیت سے بالکل خالی ہیں۔ مولانا حالی کی زبان کا پھیکا پن بہت مشہور ہے، مگر یہ جس قدر خطوط میں نمایاں ہے، اتنا ان کی اور تحریروں میں نہیں ہے۔ مولانا حالی کے خطوط مکتوبات حالی کے نام سے دو ضخیم جلدوں میں شائع ہوئے ہیں لیکن بیشتر نہایت خشک اور بے مزہ ہیں، اس کے علاوہ القاب و آداب میں بھی قدیم طریقے کی پابندی کی گئی ہے، دو خطوں کے کچھ حصے ملاحظہ ہوں۔

"برخوردار سعادت اطوار خواجہ سجاد حسین طولعمرہٗ

بعد دعا کے مدعا یہ ہے کہ لالہ بنارسی داس بی، اے متوطن پانی پت، جو علاقہ تحصیل گوجر خاں کے کسی خالصہ اسکول میں سیکنڈ ماسٹر ہیں، وہ ہمارے شفیق دوست لالہ تلسی رام صاحب ساہوکار کے نہایت قریب کے رشتہ دار ہیں۔ امید ہے کہ عنقریب معائنہ کے موقع پر وہ اپنے اسکول میں تم سے ملیں گے، چونکہ تم ان سے واقف نہ تھے اس لئے تلسی رام صاحب کی یہ خواہش تھی کہ لالہ بنارسی داس کے حال سے تم کو مطلع کر دیا جائے، تاکہ ملاقات کے وقت تم ان سے اپنے عزیز ہم وطنوں

کی طرح ملو ......"[1]

از جانب الطاف حسین بعد دعا کے واضح ہو کہ سلطان احمد خاں صاحب کے نام تمھارا خط دلی گیا تھا، اس میں تم نے اپنی علالت کا حال لکھا تھا، غالباً یہ علالت سابقہ کا ذکر ہے، جو دور از حال شروع جولائی میں بخار آیا تھا، کیونکہ پیرجی کی زبانی معلوم ہوا کہ اب بہ عنایت الٰہی طبیعت اچھی ہے، اس کا مفصل حال لکھنا، میں جب تک کہ بھائی فیاض حسین صاحب یہاں مقیم ہیں پانی پت میں رہوں گا، جب وہ مع الخیر اناوؔ روانہ ہولیں گے، اس وقت کرنال میں آکر مہینہ بیس روز رہوں گا۔ سلطان احمد خاں اور میاں عنایت اللہ کرنال آنے کا ارادہ رکھتے ہیں، میاں عنایت اللہ کا ولایت جانا ٹھہر گیا ہے، منشی صاحب نے بارہ ہزار روپیہ دینا قبول کر لیا ہے ......"[2]

سرسید کے خطوط اس سے کہیں زیادہ ادب کی چاشنی سے خالی ہیں۔ القاب و آداب میں یہاں بھی فرسودگی ہے۔ کبھی کبھی عربی کے نہایت ثقیل الفاظ استعمال کرتے ہیں، مثلاً "مراجعت متسر

---

(۱) مکتوبات حالی جلد دوم صفحہ ۳۷۲۔ (۲) ایضاً صفحہ ۲۰۳، ۲۰۲۔

ہے، تاکید اکید تصور فرمائیے، بعد معاودت، بعد سلام مسنون عجز و نیاز مشحون عرض یہ ہے، آپ کی صحت و سلامی اور خوشنودی مزاج اور مصئونی جمیع آفات سے شکر خدا کیا" وغیرہ اسی طرح فارسی کی قدیم ترکیبیں نہایت کثرت سے استعمال کرتے ہیں مثلاً "درخواست رخصت میں صرف اس قدر لکھنا بطور اطلاع کے کافی ہوگا کہ بعد آجانے منظوری رخصت اور تیار ہو جانے کے سفر ولایت کو میں فلاں شخص سے اس قدر روپیہ قرض لوں گا۔ کیونکہ بعد حصول رخصت اور بروقت چھوڑنے کام کے اس ضلع سے قرض لینا، خلاف قانون سمجھتا ہوں"...... مصنف نے لکھا ہے کہ جو الزام جلا دینے کتب خانہ مصر کا نسبت حضرت عمر لگایا جاتا ہے غلط ہے ..... آپ اس قدر عذرات مغائرانہ در باب ادائے قیمت کیوں کرتے ہیں ..... در باب سفر ولایت ..... اس نے بہت سی کتابیں دی ہیں مستعار واسطے لکھنے کتاب کے ...... میں نے آپ کو واسطے مقرر کرنے ایک ایسوسی ایشن کے خط لکھا تھا ...... عریضہ سابق میں در باب تقرر ایسوسی ایشن کے لکھا تھا اور اسی عریضہ میں منع لکھا تھا، اب بعد معائنہ اخبار مذکور کے یہ لکھتا ہوں ...... جو کچھ غصہ آپ کا مجھ حرام خور پر در باب گردن مروڑی ہوئی مرغی کے ہے وہ میری گردن پر ...... کتابیں صندوقچوں میں بند ہو رہی ہیں واسطے

روانگی ہندوستان کے ..... (۱)"

ایک خط بھی ملاحظہ ہو۔

" جناب مخدومی و مکرمی سلامت

بعد سلام مسنون التماس آنکہ جس رنج و محبت سے آپ نے مجھ کو اور میں نے آپ کو رخصت کیا ہمارا آپ کا دل جانتا ہے، اب خدا سے دعا ہے کہ انشاءاللہ تعالیٰ مع الخیر والعافیت پھر ہم سب تم سب سے ملیں گے میرا مفصل حال اخبار سوسائٹی سے معلوم ہوگا، میں بفضل الٰہی قریب عدن پہنچتا ہوں۔ چند گھنٹہ قبل عدن کے پہنچنے کے ڈاک جہاز سے لی جاتی ہے۔ اس سبب سے یہ خط ڈاک میں ڈال دیا ہے۔ چند گھنٹے بعد عدن پہنچے گی، انشاءاللہ تعالیٰ۔ مجھ کو علاوہ مفارقت احباب کے یہ رنج بڑا ہے کہ میرے پیچھے لوگ عقل کے دشمن سین ٹیفک سوسائٹی کی بڑی مخالفت کریں گے اور کوئی درجہ سعی و کوشش کا واسطے شکست کر دینے سین ٹیفک سوسائٹی کے باقی نہ رکھیں گے۔ پس میں چاہتا ہوں کہ آپ سوسائٹی کی طرف زیادہ متوجہ ہوں اور اس کو

---

(۱) یہ ٹکڑے "خطوط سرسید" سے صفحہ ۱۳ سے صفحہ ۸۰ تک سے لئے گئے ہیں۔

سنبھالنے اور ممبر دں کے بڑھانے میں زیادہ کوشش فرمادیں۔ مرزا پور کے لوگوں نے اگرچندہ نہیں دیا تو ان کو ممبر بنائیے، بہر حال سوسائٹی کے معاملہ میں حد سے زیادہ خیال دکوشش فرمادیں۔ بخدمت حاجی صاحب سلام، زیادہ بجسنر یادشما، یادشما، یادشما چہ نویسم ۔ والسلام "(۱)

لیکن شبلی کے خطوط میں ادبیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے، خطوط کیا ہیں، ادب کے شاہکار ہیں، ایک خط ملاحظہ ہو اپنے والد کو لکھتے ہیں ۔

قبلہ ام! تسلیم

گو میرا قلم خانہ نقاش کی ہمسری کرے جس سے میں اس عجیب وغریب مقام (نینی تال) کی پوری تصویر کھینچ سکوں، تاہم مجھ کو یہ امید نہیں کہ اس کوشش سے عزیزان وطن کو جو میرے خط پر آنکھیں لگائے بیٹھے ہوں گے، اپنے شوق و انتظار کا صلہ مل جائے گا"

میں بے تکلف تسلیم کرتا ہوں کہ نینی تال ایک عجیب و غریب اور حیرت انگیز مقام ہے، لیکن اگر "تعجب انگیز اور دلچسپ دفرحت زا" دو جدا چیزیں ہیں، تو مجھ ایسے ایشیائی خیال کے آدمی سے، یہ امید رکھنا عبث ہے کہ

(۱) معارف پانی پت بابت اپریل ۱۹۱۰ء صفحہ ۹۸

میں اس کو "فرحت زا" بھی مان لوں گا۔ ہاں جو لوگ انگریزوں کی ہر ادا پر جان دیتے ہیں، ان کا مذہب کیا پوچھنا۔ ع

ہر چہ آید در دلم غیر تو نیست

اب حالات سنئے۔

کاٹ گودام تک ریل ختم ہو جاتی ہے اور یہاں سے پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، کاٹ گودام سے نینی تال ۱۲ میل ہے، مگر تمام راستہ قدرت الٰہی کی نیرنگی و عظمت کا مرقع ہے، عرض میں پانچ چھ ہاتھ زمین چھوٹی ہوئی ہے، جس پر رستہ چلتا ہے، باقی ایک طرف پہاڑ کی وہ ہیبت ناک دیوار ہے، جس کی طرف دیکھنے سے نگاہ کانپ جاتی ہے، دوسری جانب نہایت عمیق ہولناک غاروں کا سلسلہ ہے اور اگر اس پہاڑ میں سخت سردی نہ ہوتی تو یہ غار بڑے بڑے اژدر اور موذی جانوروں کے دارالسلطنت ہوتے۔ نینی تال جب تین میل رہ جاتا ہے تو پہاڑ کی چڑھائی شروع ہوتی ہے۔ سطح زمین سے اس مقام کا ارتفاع تین میل سے کم نہیں، لیکن پیچ و پیچ سے راہ نکالی ہے کہ بے اختیار انگریزوں کی ہمت پر آفریں کی صدا بلند ہوتی ہے۔

آپ خود خیال کر سکتے ہیں کہ جو کوٹھا تین میل کا اونچا ہوگا، اس کے زینے کیسے پرپیچ اور دشوار گذار ہوں گے کوئی شخص کیسا ہی بے حس یا مستقل دل رکھتا ہو، یہاں پہنچکر ممکن ہے کہ حیرت کے صدمہ سے بچ سکے ......(۱)

مولانا نہایت سنجیدہ اور ثقہ عالم تھے لیکن خشک مزاج نہیں، خوش طبعی انھیں قدرت کی طرف سے کافی ملی تھی، ان کے خطوط کو پڑھنے سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان کا لکھنے والا کوئی "مولوی" ہے بلکہ کسی "رند" کا دھوکہ ہوتا ہے، اوپر مکالمہ کی شکل میں جو خط درج کیا گیا ہے، وہ مولانا کی خوش طبعی کی بہترین مثال ہے، اسی خوش طبعی نے ایک اور خط میں "شوخی" کی شکل اختیار کرلی ہے، ملاحظہ ہو

"اچھا ذرا سلاموں کا پشتارہ تو سر پر لے لو اور سب کے حصہ کا تقسیم کرآؤ، جناب حافظ حبیب اللہ صاحب جناب حافظ حسن علی صاحب جناب منشی خدابخش صاحب (بوڑھے تو شاید ہوئے، چلو اب نوجوانوں سے شروع کرو) مولوی احمد اللہ صاحب، فخر الملۃ والدین، کہیں "ف" اڑ نہ جانا، منشی حسن رضا خاں صاحب، منشی

(۱) مکاتیب شبلی حصہ اول صفحہ ۱۰

منشی ولی جان صاحب ، ہماری شادی ٹھہراتے ہی رہ گئے ، میاں خادم حسین صاحب ، ہے ہے سخت غلطی ہوئی ، ان کا نام کسی کے نام کے ساتھ ملا کر یا نیچے لکھنا تھا ۔ اگرچہ ثالث میں مونج کا بخیہ سمجھا جاتا ، مکرمی مولوی محمد عمر صاحب ، کیا خطوط کا جواب نہیں دیتے تو سلام کا جواب بھی نہ دیں گے ، افتخار القوم حضرت ماموں محمد سلیم صاحب دام فیضہم علینا ، جناب مولوی محمد حسین صاحب ، مگر جانے وہ کہاں ہوں ، میرا سلام مفت میں خاک چھانتا پھرے ، کوئی بھول تو نہیں گیا ، اہا مرزائے مختصر میاں سلیم اللہ صاحب رہ گئے اتنا سا تو قد ، مجمع میں نظر آئیں تو کیونکر ، ایک اور میرا مایۂ فخر و ناز رہ گیا ، جناب مولوی مرزا محمد سلیم صاحب خیر انھیں کے صدقے مرزائے مختصر بھی یاد آ گئے ۔ ع

به نیکاں بہ بخشد کریم

اب تو چھوٹے چھوٹے عزیز رہ گئے ، ان کو میرا سلام دعا ۔ چھوٹے ہی مزے میں رہے ، سلام و دعا دونوں سب کے نام کی تو اب جگہ نہیں (کاغذ میں) ورنہ دل میں تو سبھوں کی جگہ ہے ، ایک دو کا نام سن لو ، محمد عثمان و سلیمان ، یونس ، علاء الحق "(۱)

(۱) مکاتیب شبلی حصہ اول صفحہ ۷۶

کہا جاتا ہے کہ انگلستان کے سنجیدہ مزاحیہ نگار اور بے مثل طنز نگار سوئفٹ نے اسٹیلا کے نام جو خطوط لکھے ہیں ان میں وہ بچوں کی طرح آنکھ مچولیاں کھیلتا ہوا نظر آتا ہے، لیکن مولانا شبلی کی یہ "آنکھ مچولی" سوئفٹ سے کہیں دلچسپ اور پر لطف ہے۔

نہ صرف مولانا کے خطوط میں، بلکہ اردو زبان میں بہترین خطوط وہ ہیں، جو عطیہ بیگم اور زہرہ بیگم کے نام لکھے گئے ہیں یہاں ہندوستان کا سوئفٹ زرا زیادہ کھل پڑا ہے، اگر سنجیدگی کا دامن کہیں بھی چھوٹنے نہیں پایا۔ مولانا عبدالحق صاحب ان خطوط کے متعلق لکھتے ہیں۔

"علاوہ ان وجوہ کے، جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے، میں مولانا شبلی کے ان خطوط کو، جو انھوں نے زہرا بیگم صاحبہ اور عطیہ بیگم صاحبہ کے نام لکھے ہیں، کئی لحاظ سے قابل قدر سمجھتا ہوں، ایک تو ان کا طرز بیان نہایت سادہ، بے تکلف اور دلچسپ ہے، جو ان کی دوسری تصانیف اور رقعات میں نہیں پایا جاتا، دوسرے ان میں مولانا کے بعض ایسے خیالات پائے جاتے ہیں، جو ان کی تصانیف میں کہیں نظر نہیں آتے، اور نہ شاید کبھی گفتگو میں ان کا ذکر انھوں نے فرمایا؛ تیسرے ان خطوط سے محبت اور خلوص کی بو آتی ہے جو ان کے دوسرے رقعات میں نہیں ہے

اور یہ ایک بہت بڑی وجہ ان کی دلچسپی اور قدر کی ہے

مولانا کے ایک ارشد تلامذہ[1] نے حال ہی میں شعرالعجم کے متعلق یہ تحریر فرمایا تھا کہ وہ واقعات کی کھتونی نہیں، حسن و عشق کی داستان ہے، گویا واقعات شاعری پر کچھ اثر نہیں رکھتے، حقیقت یہ ہے کہ واقعات کی کھتونی بھی ہے اور حسن و عشق کی داستان بھی، لیکن اگر وہ ان خطوط کو دیکھتے اور اگر انھوں نے دیکھا ہے تو غور نہیں فرمایا) کہ جس داستان کا تصور ان کے ذہن میں تھا وہ شعرالعجم میں نہیں ان خطوط میں ہے۔ اس کتاب میں مولانا نے دوسروں کے جذبات سے ایک دستہ گل تیار کیا ہے، اور یہاں اپنے دلی جذبات کا اظہار فرمایا ہے، وہ نقل ہے اور یہ اصل، وہ جگ بیتی ہے اور یہ آپ بیتی اور ظاہر ہے کہ آپ بیتی میں جو مزہ ہے وہ جگ بیتی میں کہاں۔

ان خطوط میں جیسا کہ شروع میں کہہ چکا ہوں، محبت اور خلوص کی بو آتی ہے اس سے قبل مولانا کے رقعات کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں، لیکن وہ اس داستان سے

---

(۱) ۔ مجھے اس کے استعمال میں شبہ ہے، تلامذہ جمع ہے، تلمیذ کی، اس لئے ایک شخص کے لئے اس کا استعمال سمجھ میں نہیں آیا۔

خالی ہیں، محبت کے ولولے اور راز و نیاز کی سرگوشیوں
کا لطف لینا ہو تو ان رقعات کو پڑھنا چاہئے، یہ وہ
جواہر ریزے ہیں، جو ہمارے ادیبوں اور انشا پردازوں
کے کلام میں مشکل سے ملیں گے اور اگر ہیں بھی تو یا تو فرضی
اور بناوٹی یا پایۂ تہذیب سے گرے ہوئے "(۱)

تعلیمی اصلاحات

مولانا شبلی جہاں ایک بہت بڑے مورخ اور ایک بہت
بڑے ادیب اور تنقید نگار تھے، وہاں وہ بہت بڑے ماہر تعلیم
بھی تھے۔ گو مولانا کی تعلیم پر کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے، لیکن اس
موضوع پر ان کے متعدد مضامین ہیں، جو کسی تصنیف سے کم نہیں ہیں
لیکن جس طرح سرسید کی شخصیت اس لئے مسلمانوں میں ممتاز
نہیں ہے کہ انھوں نے اصلاح تعلیم پر کتابیں لکھیں، تعلیمی نظریوں کی
وضاحت کی، بلکہ وہ مسلمانوں کے سب سے بڑے آدمی اس وجہ
سے ہیں کہ ان کی تعلیمی خدمات نہایت عظیم الشان ہیں، اگر وہ اس
وقت اس کی طرف توجہ نہ کرتے تو آج مسلمانوں کا شاید وجود
بھی باقی نہ ہوتا، اسی طرح مولانا شبلی کی شخصیت بھی تعلیمی خدمات ہی کے

---

(۱) مقدمہ خطوط شبلی

لحاظ سے بہت بلند ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کے تعلیمی مضامین بڑی اہمیت رکھتے ہیں، مولانا نے اصلاح تعلیم پر نہایت مفید مضامین لکھے، نصاب تعلیم کے نقائص اور ان کی خرابیوں سے قوم کو آگاہ کیا اور یہ بھی واقعہ ہے کہ یہ مضامین ملک میں بہت مقبول ہوئے، مگر اب حالات بہت کچھ بدل گئے ہیں، زمانہ بہت آگے بڑھ گیا ہے، لیکن مولانا نے آج سے ۴۰، ۵۰ سال پیشتر جو کچھ لکھا تھا اس کی اہمیت اب بھی اپنی جگہ مسلم ہے، اور جو تجاویز مولانا نے اسوقت پیش کی تھیں وہ اب بھی قابل عمل اور تعلیمی امراض کی درماں ہیں۔ لیکن مولانا کی عملی خدمات ان سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں، قوم کو ان کے مضامین سے زیادہ ان کی کوششوں سے فائدہ پہنچا، آج علمار میں جو زندگی اور عربی مدارس میں جو اصلاح نظر آتی ہے، یہ شبلی ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے، شبلی نے جب عَلَم اصلاح بلند کیا، تو ان کی مخالفت سرسید سے کچھ کم نہیں کی گئی، بلکہ ایک لحاظ سے سرسید کی راہ نسبتاً کم پرخار تھی، کیونکہ وہ قوم کو جس چیز کی دعوت دے رہے تھے زمانے کی بھی وہی پکار تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حکومت وقت ان کی ہر طرح معین و مددگار تھی، لیکن شبلی کی حالت اس سے بہت مختلف تھی، انھیں اس حالت میں کام کرنا پڑا کہ ایک طرف حکومت ان سے بدظن اور ان کی اس تحریک سے خوف زدہ دوسری طرف قوم ان کی اصلاحات کی مخالف، اور کام کرنے والے مفقود، غرض

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز

اس حالت میں شبلی نے قوم کی عربی تعلیم کی کشتی کی ناخدائی کی
مولانا شبلی نے علی گڑھ کے دوران قیام میں انگریزی خواں
طبقہ کا بغور مطالعہ کیا تو انھیں بڑی مایوسی ہوئی، مذہب سے یہ
طبقہ بے بہرہ تو تھا ہی، خیالات کی وسعت، سچی آزادی، بلند ہمتی
اور ترقی کے جوش سے بھی تہی مایہ پایا اس لئے ان سے مایوس
ہوکر انھوں نے علمار کی طرف توجہ کی مگر یہ طبقہ بھی افسردگی اور
بددلی (Demoralization) اور تنزل و انحطاط اور پستی
وخواری (Degeneration) کا شکار تھا اور قدامت اور
روایت پرستی کے مرض میں مبتلا، مگر قوم پستی سے نکل سکتی تھی تو
ان کے دم سے اور ترقی کر سکتی تھی تو ان کی کوششوں سے
کیونکہ شبلی ان لوگوں میں سے تھے، جن کا خیال تھا کہ مسلمانوں نے
مذہب کے سہارے سے ترقی کی تھی اور آئندہ بھی مذہب ہی کے
ذریعہ ترقی کر سکتے ہیں اور ظاہر ہے مذہب میں یہ صلاحیت پیدا
کرنا علمار کا کام ہے، اس لئے شبلی نے ان کی اصلاح کی طرف
توجہ کی۔ چنانچہ ۱۸۹۴ء میں جب علمار کی اصلاح کے لئے ندوۃ العلماء
کے نام سے ایک انجمن کے قیام کی تجویز پیش ہوئی تو مولانا نے
اس کی پرزور حمایت کی اور اس کے قیام میں بیش از بیش حصہ
لیا مگر جب اس انجمن سے کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی، علمار کے

آپس کے جھگڑے اور ان کا جمود عملی حالہ قایم رہا تو پھر دوسری ترکیب اختیار کی گئی یعنی ۱۸۹۶ء میں اسی انجمن کے ماتحت ایک دار العلوم قایم کیا گیا، تاکہ اس سے ایسے علمار تیار کئے جائیں، جو بدلتے ہوئے حالات میں قوم وملک کے لئے مفید ثابت ہوں علما، نے اس کی پذیرائی کی اور اپنی خدمات سے نوازا، مگر ان میں زیادہ تر ایسے تھے، جو یا تو اس کے مقاصد سے قطعی ناواقف تھے یا اس کام کے لئے کچھ زیادہ موزوں نہ تھے، محض خوان یغما سمجھ کر اکٹھا ہو گئے تھے۔ اس لئے اس دارالعلوم کے قیام سے بھی ایک عرصہ تک نصاب تعلیم کی اصلاح نہ ہوسکی جو اس دارالعلوم کا اول ترین اور مقدم ترین مقصد تھا اور جدید علمار تیار کرنے کے لئے پہلی منزل تھی، اس سے مولانا شبلی کو جو اس تحریک کے روح رواں اور دارالعلوم کے بانیوں میں سے تھے، کس قدر تکلیف اور بے چینی تھی، اس کا ایک حد تک اندازہ ان کے خطوط سے کیا جا سکتا ہے مولانا حبیب الرحمان صاحب شروانی کو جو کمیٹی نصاب کے ناظم تھے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"آج ایک نقشہ جاریہ دارالعلوم ندوہ کا آیا۔
اس میں یہ کتابیں ہیں، ملا جلال، شرح جامی، فصول اکبری
کافیہ، میبذی، شافیہ!
مکرمی! ہم آپ خدا کو کیا جواب دیں گے، کیا ندوہ

کا یہی دعوہ تھا کہ دیوبند کی فرسودہ عمارت کو ہم کعبہ بنائیں گے، آپ نصاب کے ناظم ہیں، کیا اسی لئے؟ مانا کہ نصاب کے متعلق بعض چیزوں میں اختلاف تھا لیکن جس میں اتفاق تھا تھا، وہ کہاں ہیں، مدرسوں کو کہئے کہ کیا کر رہے ہیں۔ ان ظالموں کو شرم نہیں آتی، افسوس، افسوس!"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں۔

"میں نے مدرس اعلیٰ دارالعلوم کو نہایت سخت خط لکھا تھا کہ قدیم نصاب کیوں پڑھایا جاتا ہے، امرتسر میں جو طے ہوا، وہ کیوں نہیں پڑھایا جاتا۔ وہاں سے جواب آیا کہ جدید نصاب ہم لوگوں کو دکھلایا تک نہیں گیا۔ ہم لوگ کیا کر سکتے ہیں۔ آپ نے مدرسے میں غالباً نصاب نہیں بھیجا جس کی وجہ یہ ہوگی کہ نصاب میں کچھ اختلافات تھے لیکن بہرحال کچھ کتابیں متفق علیہ عام تھیں ان کی اطلاع تو آپ کو دے دینی چاہئے تھی، یہ نہایت تعجب کی بات ہے کہ آپ کمیٹی نصاب کے ناظم اور آج تک وہی اندھیر ہے۔

خدا کے لئے فوراً دارالعلوم کو نصاب مقررہ سے مطلع کیجئے کہ اس کو درس میں رکھیں، جو کتابیں مختلف فیہ ہوں ان کو رہنے دیجئے"

دوبارہ لکھتے ہیں

" جلسہ انتظامیہ میں یہ تو طے ہو گیا تھا کہ کسی علم کو مخلوط کر کے نہ پڑھایا جائے۔ اس سے شرح مسلم وغیرہ خود خارج ہوتی ہیں، اس کے علاوہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ آپ یہ کیوں نہیں کرتے کہ مثلاً کتب ذیل کی نسبت تمام ممبروں سے پوچھئے کہ درس میں رکھی جائیں یا نہیں شافیہ، فصول اکبری، شرح ملا، ملا حسن، میر زاہد، ملا جلال وغیرہ۔

تمہید میں یہ وجہ لکھئے کہ زمانہ درس کا اختصار ضروری ہے، اسی کے ساتھ ہر فن کی ایسی کتابیں جو تمام مسائل کو حاوی ہوں اور اس میں دوسرے علوم کی بحثیں بیچ میں نہ آئیں، میں پوچھتا ہوں کہ آخر ندوہ بھی دیوبند ہے تو قوم کا روپیہ کیوں تباہ کیا جارہا ہے۔"

ایک آدھ مہینہ کے بعد پھر لکھتے ہیں۔

" مسلمان سود بے تکلف دیتے ہیں، لیکن لیتے نہیں، حرام دونوں ہیں، لیکن پہلی صورت میں چونکہ نقصان ہے، اس لئے اس کے مرتکب اور دوسری صورت میں چونکہ فائدہ ہے، اس لئے اس سے محتنب ہیں۔"

بعینہ یہی حالت ندوہ کی ہے اور ایک خاص حصہ کے متعلق یہ حالت اب آپ کی وجہ سے ہے ندوہ میں سینکڑوں امور بے ضابطہ ہوتے ہیں، اسکی تو کچھ پرسش نہیں، لیکن نصاب کی نسبت آپ کو اس قدر ضابطہ کی پابندی ہے کہ ایک ایک حرف پر سب کا اتفاق جب تک نہ ہولے کچھ کیا نہیں جاسکتا۔

مکرمی، اس طرح کام نہیں چلتا۔ سید صاحب نے اس طرح کام نہیں چلایا۔ امرتسر میں اصولی مراتب طے ہوچکے تھے مثلاً یہ کہ مخلوط الفن کتابیں ترک کردی جائیں گی اس کے مطابق آپ ملا حسن، میر زاہد، حمداللہ، قاضی کو فوراً خارج کرسکتے ہیں، شرح ملا وغیرہ بہ تصریح خارج ہوچکی ہیں، میں مدرسین کو لکھتا ہوں، تو وہ لکھتے ہیں کہ بغیر معتمد کے حکم کے ہم کیونکر تبدیلی کریں۔ آپ فوراً لکھ دیجئے کہ فلاں فلاں کتابیں موقوف اور ان کے بجائے فلاں فلاں کتابیں اور اگر آپ اتفاق کی راہ دیکھتے رہے تو خدا کی قسم قیامت تک کچھ نہیں ہوگا، ایسی حالت میں معتمدی نصاب کا نام کیوں بدنام کیجئے"

تقریباً ایک ماہ کے بعد مولانا کو ندوہ کا مرجبہ

نصاب ملتا ہے، یہ دیکھ کر سر پیٹ لیتے ہیں کہ ابھی تک وہ تمام کتابیں زیر درس ہیں، جو مولانا کے نزدیک کسی حالت میں بھی پڑھانے کے لئے موزوں نہیں تھیں، اسی وقت مولانا شروانی کو لکھتے ہیں۔

"آپ کی اس تحریر سے کہ آپ غزل گوئی کی تاریخ لکھ رہے ہیں، نہایت خوشی اور انبساط ہوا، لیکن اسی خط میں وہ ناپاک اور نجس کورس بھی تھا، جو ندوہ میں جاری ہے، میرے محبوب! کیا آپ کا یہ کام تھا کہ سال بھر سے وہ کتابیں جو قطعاً امرتسر میں خارج کردی تھیں، جاری رہیں اور مکمل نصاب کے متفق علیہ ہونے کا انتظار کرتے رہیں، خیراب سنئے:"

اس کے بعد مولانا کتابوں کی ایک طویل فہرست لکھتے ہیں اور مشورہ دیتے ہیں کہ فلاں فلاں کتابیں نصاب سے خارج کردی جائیں اور فلاں فلاں کتابیں داخل نصاب کی جائیں، آخر میں لکھتے ہیں۔

"خدا کے لئے پھر پنچایت پر معاملہ نہ اٹھا رکھئے گا، کوئی کتاب نئی قایم کی جائے، خواہ نہ کی جائے، لیکن کافیہ شافیہ، شرح جامی، میرزاہد، ملاحسن، ملاجلال، قاضی یہ تو قطعاً نکلوا دیجئے۔ خدا کی قسم میں کانپ اٹھتا ہوں کہ ندوہ

کے تمام وعدوں کا خدا کے ہاں ہم اور آپ جواب کیا
دیں گے "

ان خطوط کو یہاں نقل کرنے سے مقصود یہ دکھانا ہے کہ نصاب تعلیم کی اصلاح کا مولانا کو کتنا خیال تھا اور اس کے لئے وہ کس قدر بے چین و مضطر تھے لیکن ظاہر ہے ندوہ سے دور اور علیحدہ رہ کر اس قدر مشکل اور عظیم الشان کام انجام نہیں دے سکتے تھے، اس لئے علی گڑھ چھوڑ کر لکھنؤ چلے آئے اور مستقل طور پر ندوہ کے لئے اپنی خدمات وقف کر دیں۔ ۱۳۲۳ھ میں دار العلوم کے معتمد تعلیم مقرر ہوئے اس لئے اب بظاہر مقصد میں کامیابی کے لئے راہ کھلی ہوئی تھی، مگر واقعہ ایسا نہیں تھا، اب بھی مشکلات تھیں اور بہت زیادہ، اسکی تفصیل خود مولانا کے الفاظ میں ملاحظہ ہو۔

" اصلاح نصاب کا خیال صرف چند علماء کے دل میں پیدا ہوا تھا، باقی تمام لوگ اسی لکیر کے فقیر ہیں اور چونکہ فیصلہ عموماً کثرت رائے پر ہوتا ہے اس لئے انھیں بزرگوں کا پلہ بھاری رہتا ہے، اس سے بڑھ کر یہ مشکل ہے کہ مدرسین جو ہاتھ آسکتے ہیں اسی قدیم نصاب کے تعلیم یافتہ ہیں۔ اس لئے وہ جدید نصاب (جس میں قدماء کی تصنیفات داخل کی گئی ہیں) کے پڑھانے سے عاجز ہیں۔ مثلاً مختصر المعانی و مطول ہزاروں دفعہ کی پڑھی پڑھائی

ہیں، ان کے بیسیوں حاشیے موجود ہیں، اس لئے ان کا
پڑھا لینا ہر کس و ناکس کو آسان ہے، لیکن جدید نصاب میں
ان کے بجائے دلائل الاعجاز عبدالقادر جرجانی رکھی
گئی ہے، یہ کتاب اگرچہ فن بلاغت کی جان ہے اور
مطول وغیرہ سب اس کے خوشہ چیں ہیں، لیکن نہ ہمارے
مدرسین نے کبھی اس کتاب کو دیکھا تھا، نہ اس پر شرحیں
اور حاشیے موجود ہیں، اس لئے یہ لوگ ان کے پڑھانے
سے عاجز ہیں اور چونکہ اپنے عجز کا تسلیم کرنا کسر شان ہے
اس لئے یہ کہتے پھرتے ہیں کہ اس قسم کی کتابوں سے کافی
استعداد پیدا نہیں ہوتی، بہرحال سال حال میں یہ قطعی فیصلہ
کیا گیا کہ جو کچھ ہو جدید نصاب جاری کر دیا جائے، اس کے
اجراء کے ساتھ فوراً ایک مدرس صاحب نے استعفا دیدیا
اور اب اخبارات وغیرہ میں مضامین شائع کئے جارہے
ہیں کہ جدید نصاب درس کے قابل نہیں بے شبہ اس
نئے راستے کے اختیار کرنے میں نہایت مشکلات پیش
آئیں گی، لیکن اگر ندوہ میں اس قدر بھی ہمت اور حوصلہ
نہیں کہ وہ مشکلات کا مقابلہ کرلے، تو اس کو سرے سے
اصلاح نصاب کا نام لینا نہ چاہیے، یہ سخت بد دیانتی ہے
کہ تمام دنیا میں اصلاح نصاب کا غل مچایا جائے اور ایک ذرہ

اصلاح نہ کی جائے۔"

مولانا نصاب میں انگریزی بھی داخل کرانا چاہتے تھے، مگر اس راہ میں اصلاح تعلیم سے بھی زیادہ مشکلات پیش آئیں۔ ایک مرتبہ مجلس انتظامیہ میں اس کی تحریک کی، مگر اسے پیش کرنے کی اجازت نہیں دی گئی، یہی نہیں بلکہ کارروائی میں اس کا ذکر تک مناسب نہیں سمجھا گیا، مولانا نے اس طرف توجہ دلائی اور خط پر خط لکھے، مگر ارباب حل وعقد نے اس کی طرف مطلق توجہ نہیں کی۔[1] چنانچہ ایک خط میں مولانا شروانی کو جھنجھلا کر لکھتے ہیں۔

"ایک ہمارے روشن خیال شروانی ہیں، جن کو میں اپنا امام کہتا ہوں، ان کا خیال ہے کہ انگریزی کے نام سے ان کو لرزہ آتا ہے، بڑی مشکلوں سے مسلمانوں کو پھسلانے کی تجویز پر راضی ہوئے، تو عمل درآمد میں حیران ہیں، حالانکہ تمام طالب علموں کو انگریزی پڑھانا مقصود نہیں، نہ میرا یہ خیال ہے، صرف اس قدر مقصود ہے کہ دو چار لڑکے انگریزی بھی پڑھیں، اتنی ذرا سی بات ان کے نزدیک اتنی عظیم الشان ہے، جس طرح محسن الملک کی فرضی یونیورسٹی! ان ہمتوں پر کوئی کیا

---

(۱) ملاحظہ ہوں خطوط نمبر ۲۰ و ۲۱ بنام مولانا شروانی مکاتیب شبلی حصہ اول

کمر باندھے ۔

آخری جملہ بڑا مایوس کن ہے، لیکن مولانا کا عقیدہ تھا کہ

عجب کیا ہے کہ بیڑا غرق ہو کر پھر اچھل آئے
کہ ہم نے انقلاب چرخ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں

اس لئے پائے ثبات میں ذرا بھی تزلزل پیدا نہیں ہوا، مایوسیوں کے بادل گھر گھر کر آتے تھے، مگر مولانا اپنی کوشش میں برابر لگے رہے ۔

چوں دمیدم عنایت توفیق ممکن است ۔۔۔ در تنگ نائے نزع نہ کوشد کسے چرا؟

اور بالآخر نصاب میں انگریزی داخل کروا کے ہی چین لیا انگریزی کو نصاب میں داخل کروانے سے، مولانا کے دو مقصد تھے۔ ایک تو اس طرح یورپین مصنفین کے اسلام پر اعتراضات اور حملوں سے علماء واقف ہوں گے اور ان کے جوابات دے سکیں گے دوسرا مقصد یورپ میں مذہب اسلام کی تبلیغ و اشاعت کرنا تھا۔ اس برائے نام انگریزی کی تعلیم سے، پہلا مقصد تو ایک حد تک پورا ہو سکتا تھا، مگر دوسرے مقصد میں کامیابی کے لئے اتنی انگریزی کسی طرح بھی کافی نہ تھی، اس لئے مولانا کا یہ بھی خیال تھا کہ آٹھ برس کی عربی تعلیم کے بعد، محض انگریزی کی تعلیم کے لئے انگریزی کا درجہ تکمیل قایم کیا جائے، چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"اور جب وہ درجہ تکمیل میں دو برس تک صرف

انگریزی پڑھیں گے، تو زبان دانی میں قابل گریجویٹوں کی برابری کر سکیں گے اور اس وقت انگریزی میں تبلیغ اسلام کو انجام دے سکیں گے۔"

مگر افسوس کہ یہ آخری امر، ارباب ندوہ کی توجہ کا اب تک محتاج ہے۔

مولانا شبلی کی عام تصانیف یقیناً اردو کے لئے مایہ ناز اور مسلمانوں کے لئے باعث فخر ہیں اور اس میں بھی کلام نہیں کہ ان سے قوم و ملک کی بہت بڑی خدمت انجام پائی، مگر مولانا نے نصاب تعلیم کی اصلاح فرما کر، ملک و قوم خصوصاً مذہب اسلام کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ ان تصانیف سے کہیں زیادہ وقیع اور قابل عزت ہیں یہ مولانا کا اتنا عظیم الشان کارنامہ ہے جس کی مثال ان کے معاصرین میں ملنی محال ہے۔

مولانا شبلی نے عربی تعلیم پر جو غیر معمولی زور دیا ہے اور اس کے لئے جو ان تھک کوششیں کی ہیں، اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ وہ جدید تعلیم کے مخالف تھے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ مولانا جدید تعلیم کے بھی ویسے ہی حامی تھے، جس طرح قدیم تعلیم کے، یعنی جس طرح وہ عربی کی تعلیم ضروری سمجھتے تھے، اسی طرح انگریزی سے واقفیت بھی لازمی سمجھتے تھے، چنانچہ جہاں ندوہ کے قیام میں ان کا ہاتھ ہے، وہاں اعظم گڑھ میں ایک ہائی اسکول بھی ان کی یادگار ہے، جس نے اب شبلی اسکول سے ترقی کر کے

شبلی نے کالج کی شکل اختیار کرلی ہے، مگر چونکہ مذہب سے ان کو عشق تھا، اس لئے ان کی یہ خواہش ضرور تھی کہ انگریزی خواں طلباء مسائل اسلام اور تاریخ اسلام سے کم از کم بہ قدر ضرورت واقف ہوں اور انھیں اس طرح مذہبی تعلیم دی جائے اور ان کی ایسی تربیت کی جائے کہ ان کے دلوں میں، مذہب کی عظمت اور بزرگی پیوست ہو جائے۔ اس کے متعلق مولانا کے ذہن میں ایک مکمل اسکیم تھی، چنانچہ ندوہ میں انھوں نے "تعلیم قدیم وجدید" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا، اس میں ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"یہ ظاہر ہے کہ انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں سے ہم کو مذہبی جذبات یعنی امامت، وعظ، افتا کا کام لینا نہیں ہے بلکہ غرض یہ ہے کہ وہ خود بہ قدر ضرورت مسائل اسلام اور تاریخ اسلام سے واقف ہوں، اس کے لئے صرف ایک مختصر اور جامع و مانع سلسلۂ کتب دینیات کی ضرورت ہے، جس میں سلسلہ بہ سلسلہ اسکول سے کالج اور کلاسوں تک کے قابل کتابیں ہوں، اس سلسلہ میں تین قسم کی کتابیں ہونی چاہئیں، فقہ، عقائد تاریخ اسلام، فقہ اور تاریخ اسلام کے متعلق مصر میں عمدہ کتابیں تیار ہو گئی ہیں، ان کا ترجمہ کافی ہوگا، عقائد کے متعلق البتہ مشکل ہے، کیونکہ ہندوستان میں جو کتابیں آج کل لکھی گئی ہیں، ان پر ابھی تمام لوگوں کا اتفاق

نہیں ہو سکتا اور مصر وغیرہ کی جدید تصانیف ناکافی اور ناقابل درس ہیں، اس لئے یہ بہتر ہوگا کہ اسکول کی کلاسوں میں صرف فقہ اور تاریخ اسلام اور سادہ عقائد کی تعلیم ہو اور کالج کی کلاسوں میں امام غزالی اور ابن رشد اور شاہ ولی اللہ صاحب کی چیدہ تصنیفات خود عربی ہی زبان میں پڑھائی جائیں اور ان سب کی مجموعی ضخامت سو دو سو صفحوں سے زیادہ نہ ہو۔

لیکن نہایت مقدم امر یہ ہے کہ کالجوں میں صرف کتابی تعلیم سے مذہبی اثر نہیں پیدا ہو سکتا، بلکہ اس بات کی ضرورت ہے کہ طلبائے کے چاروں طرف مذہبی عظمت کی تصویر نظر آئے، دینیات کے نتائج امتحان کو انگریزی تعلیم کے نتائج کی طرح لازمی قرار دیا جائے، مذہبی علماء بیش قرار مشاہرہ کے مقرر کئے جائیں، وعظ کے موقعوں پر اکثر اور ارکانِ کالج نا ارکان شریک ہوں، مذہبی پابندی کی بنا پر طلبہ کی خاص توقیر اور تحسین کی جائے اور سب سے مقدم یہ کہ دو چار طلبا کو گراں بہا وظائف دے کر، ڈگری حاصل کرنے کے بعد، مذہبی اعلیٰ تعلیم دلائی جائے۔"

شبلی پر مغرب کا اثر

نامناسب نہ ہوگا، اگر ہم آخر میں ان اثرات پر ایک سرسری نظر ڈالیں، جو شبلی کے دل و دماغ پر پڑے اور جو ان کی تمام تصانیف میں نمایاں ہیں۔

شبلی کی کتابوں کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ یوروپین مورخین اور فلاسفہ سے بہت زیادہ متاثر ہوئے ہیں اور غالباً یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کی تصانیف میں جو جدت اور خوبی نظر آتی ہے، وہ بہت حد تک انھیں اثرات کی مرہون منت ہے۔

کارلائل کی کتاب (Theory of great men) کے شبلی بہت مداح اور گرویدہ تھے اور اسکی ایک دوسری کتاب (Heroes and Hero-worship) سے، جیساکہ خود انھوں نے ایک خط میں لکھا ہے، بہت استفادہ کیا (Gibbon) کی تاریخ نے مولانا سے بہت زیادہ خراج تحسین وصول کیا۔ اگرچہ ابن خلدون پہلا شخص ہے، جس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ تاریخ طبعی ماحول سے بہت زیادہ اثر قبول کرتی ہے، لیکن بکل (Buckle) نے اس کی سائنٹفک طریقہ پر تشریح و توضیح کی، شبلی نے ان

تمام فلاسفر اور کانٹ (Cont) ٹین (Taine) ہیگل (Hegel) اور دوسرے یورپین مصنفین کے افکار وآرا سے اثر قبول کیا اور اپنی تصانیف میں ان سے بہت مدد لی۔

سب سے اہم سرچشمہ جس سے شبلی کے دل ودماغ سیراب ہوئے، سر سید کی ذات تھی، سر سید جدید مسائل پر مولانا سے بحث اور مبادلۂ خیالات کرتے، اس کے علاوہ انھوں نے اپنے بہترین کتب خانہ سے جو مشرق ومغرب کی بہترین اور نادر کتابوں پر مشتمل تھا، شبلی کو استفادہ کی پوری اجازت دے دی تھی چنانچہ مولانا اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"سید صاحب نے اپنے کتب خانہ کی عام اجازت مجھ کو دی ہے اور اس وجہ سے مجھ کو کتب بینی کا بہت موقع حاصل ہے۔ سید صاحب کے پاس تاریخ وجغرافیہ عربی کی چند ایسی کتابیں ہیں، جن کو حقیقت میں، میں کیا بڑے بڑے لوگ نہیں جانتے ہوں گے۔ مگر سب کتابیں جرمنی میں طبع ہوئی ہیں، مصر کے لوگوں کو بھی نصیب نہیں ہوئیں، گبن صاحب کی تاریخ جس کا ترجمہ سید صاحب نے چھ سو روپیہ کے صرف سے کرایا ہے، میرے مطالعہ میں ہے۔"(۱)

(۱) مکاتیب شبلی حصہ اول صفحہ ۶۰

شبلی کے اوقات کا بڑا حصہ اس کتب خانے میں صرف ہوتا تھا اور یہاں پہلی مرتبہ انھیں وسیع النظر مستشرقین کے تاریخی کارناموں کے مطالعہ کا موقع ملا اور اس مطالعہ سے سائنٹفک طریقہ پر تاریخی تحقیق و تفتیش کا ایک نیا باب شبلی کے لئے کھل گیا۔

دوسری شخصیت، جس سے شبلی متاثر ہوئے ——— (Preaching of Islam) کے مصنف آرنلڈ کی ہے۔ یہ مولانا کے استاد بھی تھے اور شاگرد بھی انھوں نے مولانا سے اور مولانا نے ان سے استفادہ کیا۔

مشرق ادنی کے اسلامی ممالک کی سیاحت سے بھی شبلی نے مغربی اثرات قبول کئے۔ سیاحت کے بعد بھی مصر سے جو مغربی تہذیب و تمدن کا گہوارہ بن چکا تھا، مولانا کے گہرے تعلقات قائم رہے، مصر کی روز افزوں ترقیوں اور تازہ ترین کتابوں سے برابر استفادہ کرتے رہے چنانچہ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں "مصر کی اصلاحات کو دیکھتا ہوں، وہاں سے جدید کتابیں، جو اب تک کسی کے پاس نہیں پہنچیں، ان کو منگوایا ہے" (۱)

مفتی محمد عبدہٗ کے شاگرد رشید، علامہ رشید رضا اڈیٹر رسالہ المنار کو ندوۃ العلوم کے اجلاس کی صدارت کے لئے دعوت دی

---

(۱) مکاتیب شبلی حصہ اول صفحہ ۱۵۲

اسی زمانے میں جرجی زیدان کی مشہور کتاب تاریخ التمدن العالم الاسلامی پر مولانا نے ایک زوردار تنقید لکھی۔ یہ مضمون المنار میں شائع ہوا اور رسالہ کی شکل میں چھپوا کر مصر و شام میں نہایت کثرت سے اس کی اشاعت کی گئی، اس سے مولانا کے تعلقات مصر کے اہل قلم سے نہایت وسیع اور مستحکم ہو گئے۔

مصر اس زمانے میں اسلامی ممالک میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک تھا، اس نے یورپ کی تقریباً تمام خصوصیات اختیار کر لی تھیں، تاریخ ادب اور دوسرے علوم و فنون کی کتابیں مغربی زبانوں سے عربی میں ترجمہ ہوئیں، شبلی ان کتابوں کو منگاتے اور ان کا مطالعہ کرتے، کارلائل کی (Heroes and Hero-worship) کا ترجمہ عربی میں شائع ہوا، تو شبلی نے اسے فوراً طلب کیا اور اس سے استفادہ کیا، ایک خط میں لکھتے ہیں" کارلائل کی کتاب کا عربی میں ترجمہ ہو گیا۔ اچھا ترجمہ کیا ہے، میرے کام کی چیز ہے" فرید وجدی کی ادارت میں ایک رسالہ" الاسلام فی عصر العلم" شائع ہوتا تھا وہ بھی برابر مولانا کے پاس آتا تھا۔ ایک مکتوب میں اس کا ذکر یوں کرتے ہیں" مصر میں ایک پرچہ اسلام کے ثبوت میں اور فلسفہ حال کی تطبیق پر نکلتا ہے اور ماہوار نکلتا ہے، زور کا پرچہ ہے اور واقعی عمدہ ہے۔ اڈیٹر فرنچ و جرمن زبان کا

ماہر ہے، میں نے منگوایا ہے اور مسلسل آرہا ہے"

ان تمام چیزوں کے، مولانا پر اثرات پڑے اور انھوں نے اپنی فطری ذہانت اور جودت کی بنا پر یورپ کی تمام خوبیوں کو اختیار کیا اور اس سے اسلام، ملک اور زبان اردو کو بیش از بیش فائدہ پہنچایا۔

مولانا کو اپنے انگریزی خواں دوستوں سے بھی مغربی لٹریچر کے استفادہ میں بڑی مدد ملی۔ اپنے عزیزوں میں مہدی جنید اور ترجمان القرآن مولانا حمیدالدین فراہی اور دوستوں میں شیخ عبدالقادر (الفنسٹن کالج بمبئی) ایم مہدی حسن، سید نواب علی، مولانا محمد (کنٹب)، مولانا عبدالمجید اور دوسرے احباب کے ذریعہ مغربی علوم و فنون پر عبور حاصل کیا۔

شبلی قدیم و جدید اور مشرق و مغرب میں امتزاج کرنا چاہتے تھے، اگر وہ علمار کی بے خبری اور ان کے جمود و تعطل سے بیزار تھے، تو نئے تعلیم یافتہ طبقہ سے بھی غیر مطمئن تھے، جو یورپ کی ذہنی غلامی میں مبتلا تھا اور جس نے مغرب کے صرف ظواہر قبول کئے تھے، نہایت درد کے ساتھ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"انگریزی خواں فرقہ نہایت بہل فرقہ ہے
مذہب کو جانے دو، یہ خیالات کی وسعت، سچی

آزادی، بلند ہمتی، ترقی کا جوش برائے نام نہیں،
یہاں ان چیزوں کا ذکر نہیں آتا، بس کوٹ پتلون
کی نمائش گاہ ہے، ہمارے شہر کے نوخیز لڑکے
مجھ کو بی، اے کی نسبت یہ خیال دلاتے تھے کہ وہ
مذہبی باتوں کو تمام تر ضعیف ثابت کردیں گے۔لاحول ولا
وہ غریب تو زمین کی حرکت بھی سمجھ نہیں سکتے۔سید صاحب
نے اکثر مجھ سے فرمایا کہ ہندوستان کے تمام انگریزی
تعلیم یافتہ مسلمانوں میں ایک بھی ایسا نہیں ہے، جو کسی
مجمع میں کچھ کہہ سکے یا لکھ سکے۔ صرف تین آدمیوں کو
مستثنیٰ کرتے تھے۔

مولانا ہندوستان کے مسلمان نوجوانوں کو ان دونوں سے
الگ نگران دونوں کا حامل یعنی

درکفے جام شریعت، درکفے سندان عشق

دیکھنا چاہتے تھے، اسی مقصد کے لئے انھوں نے ندوہ کی تاسیس
میں نمایاں حصہ لیا تھا، اور اس کے لئے اپنی خدمات وقف کی تھیں،
آج علماء اور عربی خواں طبقہ میں جو تھوڑی بہت "جدیدیت" اور
روشن خیالی نظر آتی ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ وہ شبلی کی مرہون منت نہیں!

مولانا شبلی نے نہ تو کبھی شاعر ہونے کا دعویٰ کیا اور نہ تذکرہ نویسوں اور اردو شاعری کی تاریخ لکھنے والوں نے انھیں شاعر کی حیثیت سے پیش کیا۔ حتیٰ کہ خود شبلی منزل سے شعرالہند شایع ہوئی اور مولانائے مرحوم کے ایک شاگرد رشید نے اسے مرتب کیا تو اس میں بھی شبلی کو شاعر کی حیثیت سے کوئی جگہ نہیں دی گئی، کیونکہ شبلی کے علمی کارناموں میں ان کی شاعری کو کوئی نمایاں حیثیت حاصل نہیں بلکہ یہ صرف ان کا ایک تفریحی مشغلہ تھا۔ لیکن پھر بھی یہ واقعہ ہے کہ انھوں نے شعر کہے ہیں، جو ممکن ہے کمیت کے لحاظ سے ان کے ہم عصر شاعروں کے مقابلہ میں پیش نہ کیے جا سکیں۔ مگر کیفیت کے لحاظ سے وہ اگر دوسروں سے اچھے نہیں تو برے بھی نہیں ہیں

مولانا کو تصنیف و تالیف اور دوسری مصروفیتوں کے سبب شاعری کی طرف توجہ کرنے کا بہت کم موقع ملتا تھا چنانچہ اپنے ایک دوست کو لکھتے ہیں۔

"ندوہ کی جھنجٹ اور شاعری ساتھ ساتھ چلنے کی چیز نہیں ہیں، لیکن بہر حال چارہ بھی نہیں، ندوہ فرض مذہبی اور شاعری فرض طبعی، کس کو چھوڑوں، پھر انھیں پر موقوف نہیں، یک دل اور ہزار سودا"[1]۔

لیکن بایں ہمہ مولانا کی نظموں کی تعداد بہت خاصی ہے اور بقول مصنف اردو شاعری" ان کے مختلف النوع علمی کارناموں کو نظر میں رکھ کر جب ہم ان کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم ان کے ایک نقاد کے ساتھ ہم زبان ہونے پر مجبور ہیں کہ اگر وہ ادبیات کی جانب ہر طرف سے ہٹ کر متوجہ ہو جاتے تو اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ اردو شاعری کو فائدہ پہنچا سکتے تھے، مشرقی علوم، عربی اور فارسی شاعری کی اس کے عہد بہ عہد کے تغیرات و خصوصیات سے آگاہی اور موجودہ یورپی خیالات اور حالات سے فی العلم واقفیت اور اعلیٰ فلسفیانہ نکتہ سنجی و نکتہ آفرینی یہ تمام صفات کسی پُرعظمت

---

(۱) خطوط شبلی صفحہ ۱۰۲

شاعری کی عمارت کی تیاری میں بنیاد، اینٹ، پتھر اور چونے کا کام دیتی ہیں"[1]۔

"یہ بڑی حد تک درست ہے کہ اگر شبلی اپنی تمام قابلیتوں کے ساتھ اردو شاعری اور صرف شاعری کے لئے وقف ہو جاتے تو وہ حالی سے بہت آگے نکل جاتے، ان میں ایک شاعر کی تمام قابلیتیں قدرت کی طرف سے ودیعت تھیں اگر یہ دوسرے فردوسی نہیں تو پہلے اقبال ضرور ثابت ہوتے"[2]۔

ترقی پسند شاعری کا آج کل بہت چرچا ہے۔ محض جذبات پرست نوجوان ہی نہیں، جو ہر نئی چیز کو مستحسن اور مغرب سے آئی ہوئی ہر شئے کو قابل پذیرائی سمجھتے ہیں، بلکہ بہت سے "بوڑھے" ادیب اور شاعر بھی، جدید شاعری کے نہ صرف رطب اللسان ہیں بلکہ قدیم شاعری اور ادب کو رجعت پسند اور ملک و قوم کے لئے مضر سمجھتے ہیں، لیکن اگر ترقی پسند شاعری، نام اس شاعری کا نہیں ہے، جو بحر و قافیہ کی قید و بند سے آزاد ہو اور نہ محض اس کا جو مارکس اور فرائڈ کے سیاسی، معاشی اور جنسی تصورات و

---

(۱)۔ مجلہ مکتبہ جلد ۴ شمارہ ۶، شبلی اور جوہر شاعری از احمد عبداللہ مسدوسی۔

(۲)۔ جدید اردو شاعری صفحہ ۱۳۴

تخیلات کی حامل ہو[۱] بلکہ یہ عبارت ہے اس شاعری سے جو زندگی کے حقیقی مسائل سے بحث کرے[۲]۔ اور" جو حال کا آئینہ اور مستقبل کا اشاریہ ہو، جس میں واقعیت اور تخئیلیت، افادیت اور جمالیت ایک آہنگ ہو کر ظاہر ہو، جس میں اجتمائیت اور انفرادیت دونوں مل کر ایک مزاج بن جائیں، جس میں موضوع اور اسلوب دونوں کا خیال رکھا جائے جو ہمارے ذوق عمل اور ذوق حسن دونوں کو ایک ساتھ آسودہ کرے[۳]" تو شبلی کو بغیر کسی جھجک اور تامل کے ترقی پسند شاعری کا پیش رو کہا جا سکتا ہے۔ شبلی پہلے شخص ہیں، جنھوں نے اردو شاعری کو حقیقی زندگی سے زیادہ سے زیادہ قریب کیا اور

---

(۱) سید علی اختر صاحب اختر نے ترقی پسند شاعری کی حسب ذیل تعریف کی ہے
"ترقی پسند شاعری عبارت ہے ان تصورات و تخیلات کے نظم کرنے سے جن کا مرکز ثقل مارکس و فرائیڈ کے سیاسی و جنسی مزعومات ہوں، جس شاعر کا ایمان ان مزعومات پر زیادہ ہوگا اور جس قدر وہ اپنی شاعری کو ان سے وابستہ رکھے گا، اسی قدر وہ زیادہ ترقی پسند شاعر ہوگا اور جس قدر اس کی شاعری ان سے دور ہوگی اسی قدر اس کی شاعری میں ترقی پسندی کے عناصر کی کمی ہوگی" نگار سالنامہ ۱۹۴۴ء
(۲) انجمن ترقی پسند کے اہم رکن ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب فرماتے ہیں۔
" ترقی پسند ادب وہی ہے، جو زندگی کے حقیقی مسائل سے بحث کرے" در رسالہ منزل اکتوبر و نومبر ۱۹۴۳ء، (۳) ادب اور زندگی از مجنوں گورکھپوری صفحہ ۲۴

ہندوستانی سماج اور تمدنی مسائل کا آئینہ دار بنایا، اس میں شبہ نہیں کہ اس وقت ترقی پسندی کا جو رجحان ہے، وہ شبلی اور ان کے ہم عصروں کی تحریروں اور ان کی شاعری میں مفقود ہے مگر بقول سید احتشام حسین "اس وقت اس سے زیادہ ممکن نہ تھا۔ متوسط طبقہ نہ تو اپنی روایتیں بالکل چھوڑ سکتا تھا اور نہ بڑھتی ہوئی تعلیم اور مغربی تہذیب کے اثرات کے مقابلہ میں اپنے قدیم سرمایہ پر قانع رہ سکتا تھا۔ وہ اصلاح چاہتا تھا"[1]

قدیم شاعری

بدقسمتی سے، ہماری شاعری نے اس وقت ترقی کی، جبکہ ہندوستان انتہائی انحطاط اور تنزل کے دور سے گزر رہا تھا، حکومت کا چراغ گل تو نہیں ہوا تھا، مگر ٹمٹما ضرور رہا تھا، روشنی گو باقی تھی، مگر روشنی پیدا کرنے کی صلاحیت نہ تھی، ضو ضرور تھی، مگر ضیا نہ تھی، اس کے علاوہ اس کی نشوونما غریبوں کے جھونپڑوں میں نہیں بلکہ امیروں اور بادشاہوں کے محلوں میں ہوئی تھی، اس لئے اس میں ایک طرف اگر دنیا کی بے ثباتی، زندگی سے بیزاری و بددلی، حسرت و افسردگی، پست ہمتی و احساس

---

(۱) تنقیدی جائزے صفحہ ۲۱۔

کمتری، آہ وزاری اور گریہ وبکا کی کثرت ہے، تو دوسری طرف درباری شاعری کے تمام نقائص موجود اور نمایاں ہیں۔ اسی شاعری کے متعلق مولانا حالی نے فرمایا تھا

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر   عفونت میں سنڈاس سے ہے جو بدتر
زمیں جس سے ہے زلزلے میں برابر   ملک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر

ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے اس وقت کے شاعروں اور ادیبوں کی نہایت صحیح تصویر کھینچی ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"ادیب اور شاعر جن کا کام زندگی کی ترجمانی اور حقیقت کی تفسیر ہے، زندگی کی سختیوں سے ڈر کر، حقیقت کی تلخیوں سے گھبرا کر، اپنے اپنے خیالی قلعوں میں محصور ہو گئے تھے، غم روزگار کا اندیشہ مٹانے کے لئے کوئی رندوں کی صحبت میں عشرت پرستی کی داد دے رہا تھا کوئی کنج عزلت میں خود پرستی کے مزے لے رہا تھا، خدا کی کائنات، بندگان خدا کی دنیا، مظاہر فطرت مسائل حیات کی طرف سے آنکھیں بند کر کے خودی کے عالم میں محو تھے اور اسی کو خدائی سمجھتے تھے، اپنے دلوں میں، جو حقیقی سوز سے خالی تھا جلی ہوئی راکھ کو کریدتے تھے اور کبھی ہوئی چنگاریوں کو پھونک کر دہکاتے تھے، سوزش تخیل کا نام حسن رکھا تھا، اضطراب قلب کو

عشق قرار دیا تھا اور اسی نادار حسن، اسی ناکام عشق کو خلاصۂ کائنات اور سرمایہ زندگی جانتے تھے۔

ایک طرف داستان گو جن و پری کی کہانیاں سنا کر اونگھتوں کو سلاتے تھے، رنگین مزاج سخنور ریختی کی غزل اور ریختے کے واسوخت سے بوالہوسوں کی ہوائے نفس کو بھڑکاتے تھے۔ دوسری طرف کچھ دل جلے شاعر دنیا کی بے ثباتی، انسان کی بے بسی، سعی و عمل کی بے اثری تقدیر کے ستم، فلک کے جور کا دکھڑا روتے تھے، اور حیات بے بقا سے دلوں کو پھیر کر فنا کی راہ دکھاتے تھے، گہرے جذبات اور اونچے خیالات کی کمی سے سیدھی بات میں لطف نہیں آتا تھا اس لئے بے قید مبالغے، پیچیدہ ترکیبوں، دور از کار تشبیہوں اور استعاروں سے کام لیتے تھے اور اسے معانی آفرینی اور بلند پروازی کہتے تھے۔ غزل کی قبولیت نے سب اصناف سخن کو مات کر دیا تھا، اس لئے کہ زندگی کے انتشار اور بے ربطی، طبیعتوں کی زود حسی اور تنگ ظرفی کا آئینہ غزل ہی بن سکتی تھی۔"(۱)

---

(۱) مسدس حالی صدی ایڈیشن صفحہ ۶، ۷

جدید رُجحانات

مولانا محمد حسین آزاد پہلے شخص ہیں، جنھوں نے اس کے خلاف علم جہاد بلند کیا۔ انھوں نے پرانی ڈگر سے ہٹکر نیا راستہ اختیار کیا اور فرسودہ مضامین کی بجائے نئے نئے عنوانات پر طبع آزمائی کی، مگر چونکہ یہ پہلی کوشش تھی اس لئے اس کے باوجود ان کی شاعری میں بہت سی کمیاں ہیں چنانچہ سرسید انھیں ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"آپ کی مثنوی "جواب امن" پہنچی، بہت دل خوش ہوا، درحقیقت شاعری اور زور سخنوری کی داد دی ہے۔ اب بھی اس میں خیالی باتیں بہت ہیں، اپنے کلام کو اور زیادہ نیچر کی طرف مائل کرو، جس قدر کلام نیچر کی طرف مائل ہو گا، اتنا ہی مزہ دے گا۔ اب لوگوں کی طبیعتوں سے مت ڈرو، ضرور ہے کہ انگریزی شاعروں کے خیالات لے کر اردو زبان میں ادا کئے جائیں۔ یہ کام ہے ہی ایسا مشکل کہ کوئی کر تو دے، ابھی تک ہم میں خیالات نیچر کے ہیں ہی نہیں، ہم بیان کیا کرسکتے ہیں"(۱)

---

(۱)۔ خطوط سرسید صفحہ ۲۲

اس سلسلہ میں آزاد سے جو کام رہ گیا تھا، اسے حالی نے پورا کیا۔ غالباً یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آزاد کی یہ مہم شاید پوری طرح کامیاب نہ ہوتی، اگر حالی کی مساعی بھی شامل نہ ہوتیں" الفضل للمتقدم" کے مطابق یقیناً آزاد کو حالی پر فضیلت حاصل ہے، ورنہ یہ واقعہ ہے کہ قدیم طرز شاعری کی اصلاح اور جدید شاعری کی ترویج واشاعت میں جس قدر مولانا حالی کی کوششوں کو دخل ہے، اس کی بنا پر انھیں ان کے تمام ہمعصروں پر فضیلت حاصل ہے۔

حالی نے اردو شاعری کو پست خیالات، بیکار اور فضول استعاروں اور تشبیہوں اور گل وبلبل کی داستان گوئی سے نجات دلائی اور شاعری کو زندگی سے زیادہ قریب لانے کی کوشش کی لیکن یہ ابتدائی کوششیں تھیں۔شبلی نے اسے ترقی دے کر کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ اردو شاعری کو زندگی کے حقیقی مسائل سے قریب سے قریب تر لائے، ہندوستانی تہذیب وتمدن کا آئینہ دار بنایا۔ جدید مسائل پر طبع آزمائی کی اور ایک نئی صنف شاعری کی داغ بیل ڈالی۔

سیاسی نظمیں

شبلی سے پہلے، سیاسی شاعری کا اگر کوئی وجود تھا، تو وہ نہ ہونے کے برابر ہے، قوم انتہائی تنزل اور انحطاط کے دور سے گزر رہی تھی، غیر ملکی اقتدار قوم و ملک کی جڑوں کو نہایت تیزی

سے بیخ و بن سے اکھاڑنے میں مصروف تھا اور ہمارے شاعر اور ادیب زبان و محاورہ اور طرز بیان اور اسلوب نگارش کی الجھنوں میں گرفتار تھے اور ان کے کلام میں انفرادیت اور داخلیت کا رنگ غالب اور نمایاں تھا۔ بقول رائے پوری" پلاسی کی لڑائی کتنا بڑا قومی سانحہ تھا، پانی پت کی تیسری لڑائی ہندو طاقت کے لئے پیام موت تھی، ٹیپو سلطان کی شکست مسلمانوں اور ہندوستانیوں کے تنزل کا اعلان تھا اور ان سب سے اہم ۱۸۵۷ء کا سانحہ تو ہندوستانی سماج کی بربادی کا پیش خیمہ تھا۔ کتنے شاعروں نے ان خونچکاں واقعات کو نظم کیا؟ کتنے نوحے لکھے؟ کہاں تھے وہ رجز گو مرثیہ خواں، جن کی جادو بیانی سے محرم کی ہر محفل ماتم کدہ بن جاتی تھی؟ کسی بڑے شاعر نے پلاسی کی لڑائی پر ایک نوحہ نہ لکھا واقعہ ۱۸۵۷ء پر داغ کا شہر آشوب اور غالب کے خطوط پڑھئے اور سر پیٹ لیجئے کہ جب پورے ملک کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا تھا یہ حضرات اپنی روٹیوں کے سوا کچھ نہیں سوچ سکتے تھے اور سوچتے تھے، تو اتنے بزدلانہ اور رجعت پرورانہ طریقوں سے، جو زندگی اور شاعروں کے لئے باعث ننگ ہے"[۱] اگر شبلی نے اس طرف توجہ نہ کی ہوتی، تو معلوم نہیں یہ دردناک حالت اور المناک حقیقت

---

(۱) ادب اور انقلاب صفحہ

کب تک باقی رہتی - سجاد ظہیر نے اسی وجہ سے فرمایا ہے :-

"شبلی کی عظمت کا راز کیا ہے ؟ وہ اسلامیان ہند کی تہذیبی زندگی کے اس موڑ کے راہنما ہیں، جہاں پر سرسید کا بنایا ہوا راستہ تاریخی اعتبار سے ختم ہوتا ہے اور وہ شاہراہ آزادی شروع ہوتی ہے، جس پر ابوالکلام آزاد، محمد علی، مختار احمد انصاری اور خود علامہ اقبال جیسی مقتدر ہستیاں گامزن نظر آتی ہیں۔

ان کی الفاروق نے ہمیں کیا سکھایا ؟ یہ کہ اس غلامستان ہند میں اپنا سر اونچا کر کے چلو، یہ کہ ہماری بہترین روایات ہمیں اخوت و مساوات و حریت کا سبق دیتے ہیں اور یہ کہ ہماری منزل جمہوریت ہے۔

شبلی نے اسلامی تاریخ کو اپنی قوم کے سامنے اس جوش و خروش کے ساتھ پیش کیا کہ وہ مسلمانوں کو متحرک کر سکے اور ان کے لئے تمدن و سیاست کی صحیح راہ دریافت کرنے میں مددگار ثابت ہو، اسی طرح انھوں نے ایرانی اور اردو ادب کی تنقید اس نہج سے کی کہ جس نے قوم میں مذاق سلیم پیدا کیا، جس کی وجہ سے قوم کے تہذیبی سرمایہ میں اضافہ ہوا اور خود اپنی نظروں میں اس کا وقار بڑھ گیا ان کی سیاسی نظموں نے ان کے سوئے ہوئے جذبات

کو جگا دیا، جن پر پست ہمتی اور احساس کمتری کی چادریں پڑی ہوئی تھیں۔ کانپور کے سانحہ پر ان کی مختصر نظم "ہم کشتگان معرکہ کانپور ہیں" ایسی موثر ثابت ہوئی کہ حکومت کو ضبط کرنی پڑی اور کیا "چراغ کشتۂ محفل سے اٹھیگا دھواں کب تک" والی نظم کا مسلمانوں کی تاریخ میں ہمیشہ کے لئے ایک درخشاں مقام نہیں ہے؟"[1]

شبلی نے جس جرائت و ہمت سے، سامراج پر چوٹیں کیں شہنشاہیت کے خلاف نظمیں لکھیں، غیر ملکی اقتدار کی جڑوں پر کلہاڑے لگائے، مسلمان عوام کو آزادی کی راہ پر گامزن ہونے کی تلقین کی، علماء کو حجروں سے نکلنے کی دعوت دی اور قوم پرست مسلمانوں کی رہنمائی اور قیادت کی، اس کی مثال نہ صرف ان کے ہم عصروں میں ناپید ہے، بلکہ عرصہ تک اس کا وجود نظر نہیں آتا۔

۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگال سے مسلمان غیر معمولی مضطرب اور پریشان ہیں، جنگ بلقان کے چھڑنے سے رہا سہا سکون بھی جاتا رہا اور اس نے مشتعل آگ پر تیل کا کام کیا۔ شبلی نے ان سے متاثر ہوکر "شہر آشوب اسلام" کے عنوان سے ایک نہایت پُر اثر نظم لکھی۔ جس کا ایک ایک شعر پڑھنے کے قابل ہے۔ فرماتے ہیں۔

---

(۱) خطبۂ صدارت آل انڈیا اردو کانگریس منعقدہ حیدر آباد جولائی ۱۹۴۲ء

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام ونشاں کب تک
چراغِ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک
قبائے سلطنت کے گر فلک نے کردئے پرزے
فضائے آسمانی میں اڑیں گی دھجیاں کب تک
مراکش جا چکا، فارس گیا، اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض سخت جاں کب تک
یہ سیلاب بلا، بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے
اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک
یہ سب ہیں رقص بسمل کا تماشہ دیکھنے والے
یہ سیر ان کو دکھائے گا شہید نیم جاں کب تک
یہ وہ ہیں نالۂ مظلوم کی لے جن کو بھاتی ہے
یہ راگ ان کو سنائے گا یتیم ناتواں کب تک
کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو
یہ ظلم آرائیاں تاکے یہ حشر انگیزیاں کب تک
یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحان کب تک

ذرا ملاحظہ ہو، شاعر نے قوم کو ابھارنے اور غیرت دلانے کا کتنا عمدہ طریقہ اختیار کیا ہے۔

زوال دولت عثماں زوال شرع وملت ہے

عزیزو! فکرِ فرزند و عیال و خانماں کب تک
خدارا تم یہ سمجھے بھی کہ یہ تیاریاں کیا ہیں
نہ سمجھے اب تو پھر سمجھوگے تم یہ چیستاں کب تک

اس کے بعد اسلامی حکومتوں کی زبوں حالی کی کتنی عمدہ تصویر کھینچی ہے اور مستقبل کے خطروں کو کس خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

بکھرتے جاتے ہیں شیرازۂ اوراق اسلامی
چلیں گی تند بادِ کفر کی یہ آندھیاں کب تک
کہیں اڑ کر نہ دامانِ حرم کو بھی یہ چھو آئے
غبارِ کفر کی یہ بے محابا شوخیاں کب تک
حرم کی سمت بھی صید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں
تو پھر سمجھو کہ مرغانِ حرم کے آشیاں کب تک

مقطع تو غضب کا ہے، اس کو پڑھ کر تو پتھر کا دل بھی پسیجے بغیر نہیں رہ سکتا۔

جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں
کہ اب امن و امانِ شام و نجد و قیرواں کب تک

جنگ بلقان کی آگ ابھی بجھنے نہ پائی تھی کہ ۱۹۱۳ء میں مسجد کانپور کا حادثہ پیش آیا۔" کانپور کے محلہ مچھلی بازار میں ایک مسجد بر سرِ راہ تھی، وہاں سے ایک نئی سڑک نکالی گئی

جس میں مسجد کا ایک حصہ جو وضو خانہ تھا بیچ میں آیا اور مسلمانوں کی مرضی کے خلاف زبردستی اس کو منہدم کر دیا گیا۔ اس واقعہ نے تمام مسلمانوں میں ایک آگ سی لگا دی۔ ۳ / مئی کو مسلمانان کانپور نے ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا۔ جلسہ میں کافی جوش و خروش پیدا ہوا۔ جلسے کے بعد پُرجوش مسلمانوں نے جن میں بچے بھی تھے مسجد کا رُخ کیا اور منہدم دیوار پر اینٹیں چن چن کر رکھنے لگے۔ حکام نے یہ دیکھ کر نہایت بے رحمی سے اس غیر مسلح فوج پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ اور باقاعدہ فوجی پولیس کے سپاہیوں نے ان پر گولیاں چلائیں۔ اس خونی سانحہ سے مولانا بیحد متاثر ہوئے اور یہ اثرات نالہائے موزوں بن کر ان کی زبان و قلم سے ادا ہوئے اور انھوں نے ملک کے انقلاب میں مسلم طور سے بہت بڑا حصہ لیا۔ اس واقعہ کے کئی برس بعد تک یہ نظمیں ہندوستان کے بچے بچے کی زبان پر تھیں اور اب بھی ہیں"[1]

شاعر نے اس خونیں منظر کی اتنی عمدہ اور صحیح منظر کشی اور واقعہ نگاری کی ہے کہ اس کا پورا سماں آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے اور سخت سے سخت دل بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ملاحظہ ہو۔

---

(۱) کلیات شبلی، اردو صفحہ ۸۰

کل مجھ کو چند لاشۂ بے جاں نظر پڑے
دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں
کچھ طفل خرد سال ہیں جو چپ ہیں خود مگر
بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں
ذیل کے شعر ملاحظہ ہوں ان کو پڑھ کر کون ہے جس کا
پیمانۂ صبر چھلک نہ جائے
آئے تھے اس لئے کہ بنائیں خدا کا گھر
نیند آگئی ہے منتظرِ نفخ صوُر ہیں
کچھ نوجواں ہیں بے خبر نشۂ شباب
ظاہر میں گرچہ صاحب عقل و شعور ہیں
اٹھتا ہوا شباب یہ کہتا ہے بے دریغ
مجرم کوئی نہیں ہے، مگر ہم ضرور ہیں
سینہ پہ ہم نے روک لئے برچھیوں کے وار
ازبسکہ مست بادۂ ناز و غرور ہیں
ہم آپ اپنا کاٹ کے رکھ دیتے ہیں جو سر
لذت شناس ذوقِ دلِ ناصبور ہیں
کچھ پیر کہنہ سال ہیں، دل دادۂ فنا
جو خاک و خوں میں بھی ہمہ تن غرق نور ہیں
پوچھا جو میں نے کون ہو تم؟ آئی یہ صدا

ہم کشتگانِ معرکۂ کان پور ہیں

مولانا کی سیاسی نظموں کا بہت بڑا حصہ، مسلم لیگ پر مشتمل ہے۔ انھیں پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کے دل میں آزادئ وطن کی کتنی تڑپ تھی اور وہ ہندوستان کی غلامی پر کس قدر متاسف تھے۔ ان نظموں میں ترقی پسندی اور جرائت وآزادی اس قدر نمایاں اور غالب ہے کہ یہ گمان بھی نہیں ہوتا کہ یہ بیسویں صدی کے آوائل میں کہی گئی ہیں، آج زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ ہندوستان دستوری لحاظ سے شبلی کے عہد سے کس قدر مختلف ہے۔ پہلی جنگ عظیم سے دوسری جنگ عظیم تک ملک سیاسی بے چینی اور خلفشار کا آماجگاہ بنا رہا اس درمیان میں، شہر کے مزدوروں اور دیہات کے کسانوں میں اپنی غربت وافلاس اور بیچارگی وبے بسی کا احساس پیدا ہوا۔ ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک شعور اور بیداری کی ایک نہ ختم ہونے والی لہر دوڑ گئی اور بالآخر اگست ۱۹۴۲ء میں ملک، ایک عظیم الشان انقلابی تحریک سے دوچار ہوا، لیکن آج بھی سیاسی نظموں کا معیار اس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ جو شبلی نے تقریباً نصف صدی قبل قائم کیا تھا یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ مسلم لیگ کے متعلق انھوں نے اس کے قیام کے وقت جو کچھ کہا تھا وہ آج بھی اسی طرح درست ہے، جس طرح اس وقت تھا، یہ نظمیں سیاسی نقطۂ نظر ہی سے اہم نہیں ہیں بلکہ طنز

اور ادب کی بھی جان ہیں۔ ایک نظم ملاحظہ ہو یہ اگرچہ خاصی طویل ہے مگر اس کے پڑھنے سے یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ مولانا کو لیگ سے اختلاف کیوں تھا؟ فرماتے ہیں :۔

لیگ کی عظمت و جبروت سے انکار نہیں
ملک میں غلغلہ ہے، شور ہے، کہرام بھی ہے
ہے گورنمنٹ کی بھی اس پہ عنایت کی نگاہ
نظرِ لطف رئیسانِ خوش انجام بھی ہے
کوئی ہے جو نہیں اس حلقہٗ قومی کا اسیر
اس میں زہاد بھی ہیں، رندِ مے آشام بھی ہے
فیض اس کا ہے باندازۂ طالب، یعنی
بادہ صاف بھی ہے، دردِ تہ جام بھی ہے
کعبۂ قوم جو کہتے ہیں، بجا کہتے ہیں
مرجع خاص ہے یہ، قبلہ گر عام بھی ہے
پختہ کاروں کے لئے آلۂ تسخیر ہے یہ
نوجوانوں کو جلائے طمعِ خام بھی ہے
رہنمایانِ نو آموز کا ہے مکتب درس
زینۂ فخر و نمائش گریٔ عام بھی ہے
جن مہمات میں درکار ہے ایثار نفوس
ان میں طرز عملِ بوسہ بہ پیغام بھی ہے

صدمۂ مشہد و تبریز سے آنکھیں ہیں پر آب
دل میں غمخواریٔ ترکانِ نکو کام بھی ہے
مختصر اس کے فضائل کوئی پوچھے تو یہ ہیں
محسنِ قوم بھی ہے، خادم حکام بھی ہے
ربط ہے اس کو گورنمنٹ سے بھی ملک سے بھی
جس طرح "صرف" میں اک قاعدہ ادغام بھی ہے

یہ تو لیگ کی تصویر تھی، اب ذرا اس کے دفتر کا نقشہ ملاحظہ ہو:-

اس کے آفس میں بھی ہر طرح کا سامان ہے درست
ورق سادہ بھی ہے، کلکِ خوش اندام بھی ہے
ہیں قرینے سے سجائی ہوئی میزیں ہر سو
جا بجا دفترِ پارینۂ احکام بھی ہے
چند بی اے ہیں سند یافتۂ علم و عمل
کچھ اسسٹنٹ ہیں، کچھ حلقۂ خدام بھی ہے

اس طویل تمہید کے بعد شاعر پوچھتا ہے، پوچھنے کا انداز ملاحظہ ہو۔

یہ تو سب کچھ ہے، مگر ایک گذارش ہے حضور
گرچہ یہ سوءِ ادب بھی ہے اور ابرام بھی ہے
مجھ سے آہستہ مرے کان میں ارشاد ہو یہ

سال بھر حضرت والا کو کوئی کام بھی ہے

ایک اور نظم ملاحظہ ہو :-

جناب لیگ سے میں نے کہا کہ اے حضرت!
کبھی تو جا کے ہمارا بھی ماجرا کہیئے
کلیم طور پر کرتے تھے عرض ، قوم کا حال
تو آپ شملہ پہ کچھ حال قوم کا کہیئے
معاملات حکومت میں دیجئے کچھ دخل
یہ کیا کہ قصۂ پارینۂ وفا کہیئے
خدانخواستہ ترک وفا نہیں مقصود
ہر ایک بات باندازِ آشنا کہیئے
عدالتوں کی پریشانیاں بیاں کیجئے
قسانہ ستم و جور ناروا کہیئے
درازدستیٔ پولیس کا کیجئے اظہار
مقدمات کے حالات فتنہ زا کہیئے

ان تمام گذارشوں کا جواب ملاحظہ ہو

جناب لیگ نے سب کچھ یہ سن کے فرمایا
مجھے تو خوب ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہیئے

لیکن شبلی کی مخالفت محض سلبی نہیں، ایجابی بھی تھی، وہ صرف تخریب ہی نہیں تعمیر بھی چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اگر ایک طرف مسلم لیگ کی شدت سے مخالفت کی، تو دوسری طرف قوم پرست مسلمانوں کو خطاب کرکے مرکز کی ضرورت و اہمیت پر بھی زور دیا۔ فرماتے ہیں :-

یہ جو لیڈر شکنی کی آپ نے خوب کیا
قوم اب طوقِ غلامی سے ہے بالکل آزاد

لوگ اب حلقۂ تقلید میں ہوں گے نہ اسیر
ٹوٹ جائے گا طلسمِ اثرِ استبداد
ہاں مگر ایک گذارش بھی ہے یہ قابلِ غور
یہ تو فرمائیے اس باب میں کیا ہے ارشاد؟
بتکدے آپ نے ڈھائے بہت اچھا، لیکن
دیکھئے یہ کہ کہیں زخم میں آئے نہ فساد
آپ کہتے ہیں کہ وہ مجمع ناجائز تھا
خیر جو کچھ تھا، مگر جمع تو تھے کچھ آزاد
اب کوئی مرکزِ قومی ہے نہ توحیدِ خیال
نہ کوئی جادۂ مقصد ہے نہ کچھ توشۂ زاد
خوف یہ ہے کہ بکھر جائے نہ شیرازۂ قوم
خوف یہ ہے کہ یہ ویرانہ، نہ ہو پھر آباد
ذرے جس طرح سے ہو جاتے ہیں اڑ اڑ کے فنا
یوں ہی ہو جائے گی پھر قوم بھی آخر برباد
نکتہ چینی سے فقط کام نہیں چل سکتا
یہ بھی لازم ہے کہ کچھ کام بھی ہو بیش نہاد
بھاپ پر زور ہے، لیکن کوئی انجن بھی تو ہو
کام کیا آئے گا نشتر جو نہ ہو گا فصاد

شبلی نے ایک ہندوستانی کی حیثیت سے، اگر ایک طرف اپنی نظموں کے ذریعہ ہندوستان کی تحریک آزادی کو تقویت پہنچائی، تو دوسری طرف، ایک مسلمان کی حیثیت سے، عالم اسلام

کی خدمت اپنی زندگی کا مطمح نظر قرار دیا اور بقول سید سلیمان صاحب ندوی "بتیس برس (۱۸۸۲ء۔ ۱۹۱۴ء) تک ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کی اسلامی دنیا کو اپنے قلم کی روانی سے سیراب، اپنی شعلہ نفسیوں سے گرم اور اپنی نواسنجیوں سے پرشور رکھا۔

سالہا گوش جہاں زمزمہ خواہد بود
زیں نواہا کہ دریں گنبدِ گردوں زدہ است"(۱)

اُس وقت اسلامی ممالک میں صرف ترکی ایک ایسا ملک تھا، جہاں اسلامی شان وشوکت کے کچھ آثار نظر آتے تھے اس لئے مولانا کو اس سے بڑی الفت اور محبت تھی، اس کی ترقیوں اور کامرانیوں کی اطلاع پاتے تو باغ باغ ہو جاتے۔ چنانچہ ۱۹۰۸ء میں جب دستوری حکومت کا اعلان کیا گیا، تو مسرت وخوشی اور کیف و سرور سے بیخود ہو کر ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"ترکی کی جدید زندگی نے اس کے ہواخواہوں کو مخمور کر دیا ہے۔ کیا بتاؤں، عربی اخبارات میں آجکل کیا نشہ ہے ، سوسو دفعہ پڑھتا ہوں اور سیر نہیں ہوتا، آپ کو مبارک ہو کہ آزادی کے جو جلوس نکلے ان میں تین ہزار

---

(۱) حیات شبلی صفحہ ۱

کی جمعیت کا ایک کمانڈر ایک جنس لطیف تھی ..... ایران اور ٹرکی کی پارلیمنٹ یورپ کا اثر نہیں، گو توارد ہے۔ امرہم شوریٰ کا سبق مسلمانوں کو اب یاد آیا اور چونکہ گھر کی چیز تھی، کسی کی نکسیر تک نہ پھوٹی۔ خدا کی قسم یہ جوش، یہ صداقت، یہ مسرت، یہ اعتدال، دنیا کی تاریخ دکھائے گی تو اسلام ہی کے آئینہ میں دکھائے گی، خیال فرمایئے، آٹھ لاکھ آدمیوں کا دریا قسطنطنیہ میں کوہ شکن موجیں لے رہا تھا اور ایک تنکے کا بال بیکا نہ ہوا، معاویہؓ کی غلطی کا کفارہ عبدالحمید نے ادا کیا"

۱۹۱۲ء میں جب بلقان کی ریاستوں نے ترکی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تو مولانا اس سے بہت متاثر ہوئے اور "شہر آشوب اسلام" کے نام سے ایک طویل نظم لکھی، جو اپنے اندر بے پناہ تاثیر رکھتی ہے۔" یہ نظم رفاہ عام لکھنؤ کے جلسہ میں پڑھی گئی تھی اور جب پڑھی گئی تھی تو اس کا یہ اثر تھا کہ صدر سے لے کر پائیں تک ماتم برپا ہو گیا تھا"[۱]

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام ونشاں کب تک
چراغ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک
قبائے سلطنت کے گر فلک نے کر دیئے پرزے

---

[۱] کلیات شبلی (اردو) صفحہ ۱۵

فضائے آسمانی میں اڑیں گی دھجیاں کب تک

مراکش جاچکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض سخت جاں کب تک

یہ سیلاب بلا بلقان سے بڑھتا آتا ہے
اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک

یہ سب ہیں رقص بسمل کا تماشا دیکھنے والے
یہ سیر ان کو دکھائے گا شہید نیم جاں کب تک

یہ وہ ہیں نالۂ مظلوم کی لے جن کو بھاتی ہے
یہ راگ ان کو سنائے گا یتیم ناتواں کب تک

یورپ کے لوگ، اپنے کو تہذیب و تمدن اور انسانیت کا علم بردار کہتے ہیں، مولانا ان کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں۔

کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو!
یہ ظلم آرائیاں تاکے، یہ حشر انگیزیاں کب تک

یہ جوش انگیزی طوفان بیداد و بلا تاکے
یہ لطف اندوزی ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک

یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر ہو گا اس کا امتحاں کب تک

نگارستان خوں کی سیر گر تم نے نہیں دیکھی
تو ہم دکھلائیں تم کو زخم ہائے خونچکاں کب تک

ایک جگہ اشاروں اشاروں میں مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دیتے ہیں۔

زوالِ دولتِ عثماں زوالِ شرع و ملت ہے
عزیزو فکر فرزند و عیال وخانماں کب تک
خدارا تم یہ سمجھے بھی کہ یہ تیاریاں کیا ہیں؟
نہ سمجھے اب تو پھر سمجھوگے تم یہ چیستاں کب تک

مقطع ملاحظہ ہو، جذب و تاثیر میں کس قدر ڈوبا ہوا ہے۔

جو ہجرت کرکے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں
کہ اب امن و امانِ شام و نجد و قیرواں کب تک

غرض شبلی نے ہندوستان اور اسلامی ممالک پر متعدد پُرزور نظمیں لکھیں اور بقول سید سلیمان صاحب ندوی" علمار میں وہ پہلے شخص تھے، جنھوں نے وقت کی سیاسی باتوں میں دلچسپی لی، کانگریس کی حمایت کی، ہندو مسلم سیاسی مصالحت پر مضامین لکھے مسلم لیگ کے زاویۂ نظر بدلنے کے لئے متعدد مضامین اور بیسیوں نظمیں لکھیں۔ احرار اسلام کی رہنمائی کی اور ان کی بے راہ روی پر ان کو ٹوکتے بھی رہے، ہندوستان میں عالمگیر اتحاد کے وہ داعی اول تھے، اوقاف اسلامی، وقف علی الاولاد تعطیل جمعہ اور دوسرے اسلامی مسائل کو حکومت وقت کے سامنے پیش کرکے تحریک کو کامیابی کی حد تک پہنچایا اور عام مسلمانوں پر ان کا یہ بڑا احسان ہے۔ اس روشنی میں دیکھئے کہ اب آجکل جو حضرات علمار میں سیاسی گرمی ہے، مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت کا جوش ہے، ملکی مطالبات کے ساتھ ہم آہنگی ہے اور ہندو مسلم اختلافات کے دور کرنے کے لئے جو دور بینی ہے وہ کس کی پکار کا نتیجہ ہے۔ مولانا نے

علمار کے طبقہ میں جن نئے خیالات اور حالات کی پرورش کی اور ان کی جامد سطح میں جو حرکت پیدا کرنی چاہی، اس کا یہ مختصر خاکہ ہے ان کے ذہن میں اس انقلاب کے لئے تدریج کی ضرورت تھی اور وہ اپنی تصنیفات میں اسی پر عمل پیرا تھے۔"[1]

سیاسی شاعری اور مولانا کے ہم عصر

ابتدا ہی میں، ہم عرض کر چکے ہیں کہ شبلی پہلے شخص ہیں جنھوں نے نہایت جرأت و بے باکی کے ساتھ آزادئ وطن کے لئے نظمیں کہیں ان کے ہم عصروں میں صرف اکبر، اقبال اور چکبست کے نام لئے جا سکتے ہیں، جنھوں نے سیاسی نظمیں کہیں، مگر ان میں سے بھی اول الذکر دو بزرگوں نے خالص سیاسی نظمیں اتنی کم کہی ہیں۔ جو نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ایک فاضل نقاد کے الفاظ میں،

"اقبال کی شاعری میں ہندوستان کی سیاسی بے چینی کا بہت معمولی سا عکس ملتا ہے"[2] اور وہ بھی تشبیہ اور استعارے کے لباس میں مثلاً:-

---

(۱) حیات شبلی، دیباچہ صفحہ ۴۰

(۲) نگار سالنامہ ۱۹۴۲ء مضمون ہماری شاعری کے جدید رجحانات از سید صفدر حسین صفحہ ۶۱۔

چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤگے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اکبر، بقول پروفیسر آل احمد صاحب سرور "سرکاری ملازمت کی وجہ سے، جو کہنا چاہتے تھے، صاف صاف نہ کہہ سکے تھے پردے پردے میں حال دل بیان کرتے تھے، وہ احتیاط آخر تک قائم رہی"[1] چنانچہ وہ مزاحیہ اور طنزیہ انداز میں، صرف اشارے پر اکتفا کرتے ہیں۔

رزولیوشن کی شورش ہے، مگر اس کا اثر غائب
پلیٹوں کی صدا سنتا ہوں اور کھانا نہیں آتا
عزت ملی ہے شرکت کونسل کی شیخ کو
غازہ ملا گیا ہے، رُخِ فاقہ مست پر
کام اس ملک میں ہو سلف گورنمنٹ سے کیا
زہر کو ہضم کرے کوئی پیپرمنٹ سے کیا

---

(۱) تنقیدی اشارے صفحہ ۸۰

یہی نہیں کہ اکبر آزادئ وطن کا کوئی مطالبہ نہیں کرتے، بلکہ ان کے نزدیک، اس کا مطالبہ نامناسب تھا، چنانچہ فرماتے ہیں۔

ادھر خیال نہیں مصلحان نیشن کا کہ فرط ضعف نہیں وقت آپریشن کا

اس کے برخلاف برطانیہ کی تعریف و توصیف میں ان کے بہت سے شعر مل جائیں گے۔ مثلاً

بہت ہی عمدہ ہے اے ہم نشیں برٹش راج
کہ ہر طرح کے ضوابط بھی ہیں اصول بھی ہے

ہندوستانی عدالتوں کے متعلق شبلی نے کہا ہے۔

عدالتوں کی پریشانیاں بیاں کیجئے فسانہ ستم و جور ناروا کہئے

اور اکبر فرماتے ہیں

جو چاہے کھول لے دروازۂ عدالت کو
کہ تیل پیچ میں ہے، ڈھیلی اس کی چول بھی ہے
نگاہ کرتے ہیں حاکم بہت تعمق سے
تمھاری عرض میں گو کچھ زیادہ طول بھی ہے

برطانوی راج کے متعلق یہ عام شکایت ہے کہ اس کی وجہ سے اتحاد و اتفاق کی بجائے افتراق و ناچاقی اور صلح و آشتی کی جگہ، فرقہ وارانہ لڑائیاں اور جھگڑے پیدا ہوئے اور آزادئ رائے کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ مگر اکبر — خدا انھیں غریق رحمت کرے، فرماتے ہیں۔

خلل نہ شغل میں بدھو کے ہے نہ ختو کے
کہ شیخ شدھ بھی ہیں اور قدم رسول بھی ہے

عطا ہوئی ہے یہ اسپیکروں کو آزادی
گر حاکموں میں ہے قال تو یاں اقوال بھی ہے

دربار ۱۹۱۱ء کے موقع پر فرماتے ہیں

شکوہ جلوۂ قیصر عیاں ہے — زمیں پر آج اترا آسماں ہے
کرم فرما ہوا ہے شاہ انگلینڈ — کہ جو شاہنشہ ہندوستاں ہے

ذرا ملاحظہ ہو، ہندوستان کی کس قدر غلط ترجمانی کی گئی ہے

نہایت فخر ملک ہند کو ہے — کہ اس کا شاہ اس کا میہماں ہے

اور آخر میں تو کمال ہی کر دیا، فرماتے ہیں

خدا اس عہد کو رکھے مسلسل — کہ حاصل نعمت امن واماں ہے

اسی وجہ سے ان کے متعلق ایک نقاد کی رائے ہے کہ "عمر بھر یا تو سرکاری ملازم رہے یا حکومت کے پنشن خوار، ایسی حالت میں کوئی مخالفانہ نظریہ بیان کرنا، آسان نہ تھا، اس لئے لبوں پر تمام عمر مصلحت اندیشیوں کی مہر لگائے رہے"[1] البتہ پنڈت برج نرائن چکبست نے نہایت کثرت سے سیاسی نظمیں کہی ہیں اور حکومت پر نہایت سختی سے اعتراضات بھی کئے ہیں، لیکن پھر بھی شبلی اور چکبست کی "چوٹوں" میں بڑا فرق ہے۔ چکبست بقول آل احمد صاحب سرور اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے جسے آج ہم لبرل اور ریفارمسٹ (Reformist) کہتے ہیں[2]۔ اور شبلی اپنے عہد کے شیدائیانِ آزادی کی صف اول میں نظر آتے ہیں

---

(۱) نگار سالنامہ ۱۹۴۲ء صفحہ ۶۰ (۲) تنقیدی اشارے صفحہ ۹۰

مولانا شبلی کا زمانہ وہ زمانہ تھا جبکہ سیاسی شعور ابھی ابتدائی دور میں تھا لوگ نکتہ چینیاں کرتے تھے مگر دبی زبان سے کانگریس کو نہ وہ قوت حاصل تھی اور نہ عوام میں وہ مقبولیت جو ۱۹۲۰ء کے بعد نصیب ہوئی لیکن چکبست ابھی حال تک (۱۹۲۶ء) زندہ تھے انھوں نے ۲۱-۱۹۲۰ء کا ہنگامہ خیز زمانہ دیکھا تھا - وہ زمانہ بھی دیکھا تھا جب کانگریس ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں بہت زیادہ مقبول تھی اور ہندوستان کی واحد سیاسی جماعت تھی اور ایسی جماعت جس نے حکومت کا ناطقہ بند کر رکھا تھا پوری آزادی اور پوری بے باکی کے ساتھ حکومت پر اعتراض کئے جاتے تھے اس لئے قدرتی طور پر دونوں کے خیالات دونوں کی نکتہ چینیوں اور دونوں کے اعتراضات میں فرق ہونا چاہئے مگر یہ عجیب بات ہے کہ جب ہم دونوں کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو شبلی کو خیالات کے لحاظ سے دور جدید کے پیامبر چکبست سے کہیں آگے پاتے ہیں - اس میں شبہ نہیں کہ چکبست نے نہایت صاف صاف کہا ہے

ہیں باغباں کے بھیس میں گلچیں فرنگ کے
نکلے ہیں لوٹنے چمن روزگار کو

وطن میں بے وطن مجھ کو کیا ہے اک ستمگر نے
نہ میں ہندوستاں کا ہوں نہ ہے ہندوستاں میرا

ملک میں دولت نہیں باقی دوا کے واسطے

ہاتھ خالی رہ گئے ہیں اب دعا کے واسطے

اور اس لئے وہ سوراج کا مطالبہ بھی کرتے ہیں۔

دل تڑپتا ہے کہ سوراج کا پیغام ملے   کل ملے آج ملے صبح ملے، شام ملے

لیکن سوراج کا تصور کیا ہے ملاحظہ ہو

مجھ کو مل جائے چہکنے کے لئے شاخ مری

کون کہتا ہے کہ گلشن میں نہ صیاد رہے

برطانیہ کا سایہ سر پر قبول ہوگا

ہم ہوں گے عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا

سر پر شاہ کا اقبال ہو بہار چمن   رہے چمن کا محافظ یہ تاجدار چمن

چکبست کو برطانیہ کی خوشنودی اس قدر عزیز ہے کہ ہندوستان کے نوجوانوں کو جرمنی کی توپوں کا نشانہ بننے کے لئے بھیجتے ہیں اور انھیں "تاج شہ لندن کے نگیں" "نمک خوار" اور "وفادار" کے ناموں سے خطاب کرکے فخر محسوس کرتے ہیں۔

جاں نثار آج تمھارا سا زمانے میں نہیں

ہاں دکھا دو کہ ہو تاج شہ لندن کے نگیں

دوست کیا چیز ہیں، دشمن ہوں فدائے تحسیں

آسماں وجد کرے ہل اٹھے رن کی زمیں

یوں تو لڑنے کو بہت شہ کے نمک خوار لڑے

اور ہی شان سے لیکن یہ وفادار لڑے

لیکن شبلی نہ تو "شہ کے نمک خوار" ہونے پر فخر کرتے ہیں اور نہ "برطانیہ کا سایہ سر پر قبول ہوگا" کو گوارہ کرنے کے لئے تیار ہیں
اسی جنگ عظیم کے موقع پر، جبکہ چکبست نے "ہاں دکھا دو کہ ہو تاج شہہ لندن کے نگیں" والی نظم کہی تھی، شبلی نے غالب کے مشہور شعر کی

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا   لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

تضمین کی تھی، اس پر حکومت نے ان کی گرفتاری کا حکم دیا تھا، لیکن مولانا خود مرض الموت میں گرفتار تھے ...... یہاں تک کہ شاعر چند روز کے بعد خود قید عنصری سے آزاد ہو گیا"[1]

مولانا نے مسلم لیگ کی مخالفت میں متعدد نظمیں کہی ہیں۔ اس مخالفت میں صرف ایک جذبہ کارفرما تھا، وہ یہ کہ جنگ آزادی کی راہ میں مسلم لیگ کسی قربانی اور ایثار کے لئے تیار نہیں تھی اور مولانا آزادیٔ وطن کے لئے اس قدر بے چین تھے کہ اس راہ میں جو جماعت بھی حائل ہو، اس کی مخالفت ملک و قوم کے مفاد کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ ذیل میں ان کے ایک مضمون سے چند اقتباسات درج کئے جاتے ہیں، ان کی روشنی میں، مخالفت کے صحیح اسباب اور وجوہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:۔

"سب سے پہلا اور مقدم کام یہ ہے کہ مسلم لیگ اپنے مقاصد کے دائرے کو وسعت دے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں

---

(۱) حیات شبلی صفحہ ۶۲۵

جو کسی خاص فرقہ سے تعلق رکھتی ہیں - ان کے علاوہ ان چیزوں کو اپنا نصب العین قرار دے جن پر ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ موقوف ہے ۔ مثلاً ایک بندوبست کا مسئلہ جس کو لیگ نے کبھی خیال کے ہاتھ سے بھی نہیں چھوا ۔ یہ وہ مسئلہ ہے جس پر ہندوستان کی سرسبزی کا دارومدار ہے کاشتکار روز بہ روز مفلس ہوتے جاتے ہیں - ہر بندوبست مالگذاری میں اس قدر اضافہ کر دیتا ہے کہ جو زمینیں مویشی کا حق تھیں ان کو اپنے کام میں لانا پڑتا ہے - چارہ نایاب ہوتا جاتا ہے - چراگاہیں مزروعہ بنتی جاتی ہیں ۔ ایک فصل بھی اگر کم ہو جائے تو فاقہ کی نوبت پہنچ جاتی ہے - ہزاروں کاشتکار گھر چھوڑ چھوڑ کر نئی آبادیوں میں بھاگتے جاتے ہیں - مالگذاری کے وقت ہزاروں لاکھوں کے زیورات رہن ہو کر بے درد مہاجنوں کے گھر پہنچ جاتے ہیں ۔ بایں ہمہ تیسویں سال نیا بندوبست ہوتا ہے اور زمیندار نئے بندوبست کے نام سے دہل جاتا ہے ۔ "

" فرض کرو اگر بنگال کی طرح ہمارے ملک میں بھی استمراری بندوبست ہو جائے تو یہ ہندوستان کے حق میں رحمت ہوگا یا یہ کہ چند مسلمانوں کو موجودہ تعداد سے زیادہ نوکریاں مل جائیں ۔

" پہلا سوال یہ ہے کہ مسلم لیگ اس خصوصیت کو چھوڑ دے گی کہ اس کو سب سے پہلے دولت اور جاہ کی تلاش ہے

اس کو اپنے صدر انجمن کے لئے ۔ نیابت صدر کے لئے
سکرٹری شپ کے لئے ۔ ارکان کے لئے ۔ اضلاع کے
عہدہ داروں کے لئے وہ مہرے مطلوب ہیں جن پر طلائی
رنگ ہو۔ لیکن پولٹیکل بساط میں ان مہروں کی کیا قدر ہے
کیا ایک معزز رئیس ، ایک بڑا زمیندار ، ایک حکام رس
دولتمند کسی تحریک کے لئے اپنی جائداد ، اپنی حکام رسی
اپنی فرضی آبرو کو نقصان پہنچانا گوارہ کرسکتا ہے ؟"
آگے چل کر مسلم لیگ کو رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں
"مسلم لیگ کی انتظامی کمیٹی بڑے بڑے زمینداروں
اور علاقہ داروں سے بالکل خالی کرلی جائے ۔ صرف وہ
لوگ شریک کئے جائیں جو آزادی اور حق گوئی کے ساتھ
اظہار رائے کرسکیں ۔"
انھیں خیالات کو الفاظ بدل کر اپنے مضمون " لیڈروں کا
قصور ہے یا لیڈر بنانے والوں کا " میں یوں لکھتے ہیں :۔
" اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ لوگ جو بڑے بڑے
لمبے خطاب رکھتے ہیں جو بڑی بڑی جائدادوں کے مالک
ہیں ۔ جن کو اپنے ذاتی معاملات کی وجہ سے ہر وقت حکام
کی خوشنودی کی نبض دیکھتے رہنے کی ضرورت پڑتی ہے وہ
قوم کے لیڈر نہیں ہوسکتے ۔ وہ کسی طرح آزادانہ رائے نہیں

دے سکتے۔ ان کی جو پوزیشن ہے وہ جس کو حاصل ہو جائے گی اس کو بھی وہی کرنا پڑے گا جو وہ کر رہے ہیں ......

...... لیڈری کے لئے وہ شخص درکار ہے جو مسٹر گوکھلے کی طرح خطاب، جائداد، دولت اور تمام تعلقات سے آزاد ہو۔ پُر جوش اور دلیر ہو، اس کے ساتھ پالیٹکس کا ماہر ہو اور پولیٹکل لٹریچر کا مدتوں مطالعہ کر چکا ہو۔ اگر قوم میں ایسے شخص موجود نہیں ہیں جو لیڈری کے تخت کو اور بھی چند روز خالی رکھتا اور واقعی تخت نشین کا انتظار کرنا چاہئے سچ اور بالکل سچ ہے کہ لیڈروں کا نہیں بلکہ لیڈر بنانے والوں کا قصور ہے۔ اس لئے کہ وہ پہلے ایک شہنشاہی قائم کرتے ہیں تاکہ اس کے سائے میں اور چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم ہو سکیں جن میں سے کوئی حکومت ان کے بھی زیر نگیں آجائے۔"

مذکورہ بالا اقتباسات میں مولانا نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، اس کی مثال، ان کے ہم عصروں میں ملنا مشکل ہے۔ اسی قسم کے خیالات، جو ان کی عہد کی شاعری میں بالکل مفقود ہیں۔ ان کی نظموں میں بھی کہیں کہیں ملتے ہیں، مثلاً

گذر رہی ہے یہ جو کچھ کہ کاشتکاروں پر
یہ داستان الم ناک دغم فزا کہیئے

امتحانات سول کے لئے لندن کی یہ قید
ہے یہ رفتار ترقی کے لئے سخت مخل
یہ جو پیمائش ارضی کا ہے ۳۰ سالہ رواج
ملک کے حق میں ہے یہ زہر سے بڑھ کر قاتل
جو مناصب کہ ولایت کے لئے ہیں مخصوص
آج ابنائے وطن بھی تو ہیں اس کے قابل
ذیل کا شعر ملاحظہ ہو
صیغہ فوج میں تخفیف مصارف ہے ضرور
سینہ ملک پہ افسوس کہ بھاری ہے یہ سل

غرض مولانا کا پورا کلیات ایسی نظموں سے بھرا پڑا ہے جن میں یا تو ہندوستان کی غلامی پر رنج وغم کا اظہار اور استخلاص وطن کے لئے اہل وطن کو تحریص کی گئی ہے یا عالم اسلام کی زبوں حالی پر دلگداز نوحے ہیں، مگر ہمت شکنی اور یاس انگیزی کی ہوا تک لگنے نہیں دی ہے اور قوم کو اسلاف کے کارنامے یاد دلا کر نہایت حوصلہ افزا الفاظ میں رجز خوانی کی گئی ہے۔

عجب کیا ہے کہ بیڑا غرق ہو کر پھر ابھل آئے
کہ ہم نے انقلاب چرخ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں

مذہبی اور تاریخی نظمیں

اردو کی قدیم شاعری میں اخلاقی اشعار اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں، لیکن یہ جواہر اس قدر منتشر اور دوسری چیزوں میں اس طرح دبے ہوئے ہیں کہ ان کا ہونا نہ ہونے کے برابر ہے، لیکن شبلی نے ادھر توجہ کرکے، ان جواہر ریزوں میں اتنا گراں بہا اضافہ کیا ہے کہ انھیں اگر اردو کا سعدی کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

حصول آزادی کے لیے شبلی کس قدر بے چین اور بے تاب تھے، اس کا اندازہ ان کی سیاسی نظموں سے ہو چکا ہوگا۔ لیکن وہ جسمانی آزادی سے کہیں زیادہ "دماغی آزادی" کے خواہش مند تھے وہ یہ دیکھ کر کہ مسلمان خصوصاً مسلمان نوجوان مغرب کی بے روح تہذیب و تمدن سے مسحور ہوتے جا رہے ہیں اور ان کی اسلامی روایات سے بیگانگی، دینی شعار سے تغافل اور مذہبی قیود سے نفرت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ بے تاب اور بے چین ہو جاتے۔ انھیں کامل یقین تھا کہ جس طرح قرنِ اول کے مسلمانوں نے مذہب کو اختیار کرکے عروج حاصل کیا تھا اسی طرح آج کے مسلمان بھی مذہبی تعلیمات پر عمل کرکے موجودہ قعر مذلت سے نکل سکتے ہیں۔ چنانچہ "اسلام کے زوال کا اصلی سبب" میں انھوں نے بتلایا ہے کہ مذہب سے بیزاری اور بے عملی ہی، اسلام کے زوال کا اصلی سبب ہے۔ چند متفرق شعر

ملاحظہ ہوں۔

اعتقادات میں ہے سب سے مقدم توحید
آپ اس وصف کو ڈھونڈیں تو کہیں نام نہیں

کون ہے شائبۂ شرک سے خالی اس وقت
کون ہے، جس پہ فریب ہوس خام نہیں

اب عمل پر جو نظر کیجئے آئے گا نظر
کہ کسی ملک میں پابندیٔ احکام نہیں

نص قرآن سے مسلمان ہیں بھائی بھائی
اس اخوت میں خصوصیت عام نہیں

یاں یہ حالت ہے کہ بھائی کا ہے بھائی دشمن
کون سا گھر ہے، جہاں یہ روشِ عام نہیں

نہ کہیں صدق و دیانت ہے نہ پابندی عہد
دل ہیں ناصاف زبانوں میں جو دشنام نہیں

الغرض عام ہے وہ چیز جو بے دینی ہے
صاف یہ بات ہے دھوکا نہیں ابہام نہیں

ان حقایق کی بنا پر سبب پستیٔ قوم
ترک پابندیِ اسلام ہے، اسلام نہیں

مذہب یا سیاست میں فرماتے ہیں:۔

تم کسی قوم کی تاریخ اٹھا کر دیکھو

دو ہی باتیں ہیں کہ جن پر ہے ترقی کا مدار
یا کوئی جذبۂ دینی تھا کہ جس نے دم میں
کر دیا ذرۂ افسردہ کو ہم رنگ شرار
ہے یہ وہ قوت پرزور کہ جس کی تکرار
سنگ خارا کو بنا دیتی ہے اک مشت غبار
اس کی زد کھاکے لرز جاتی ہے بنیاد زمیں
اس سے ٹکرا کے بکھر جاتے ہیں اوراق دیار
یا کوئی جاذبۂ ملک و وطن تھا جس نے
کر دئے دم میں قوائے عمل سب بیدار
ہے اسی سے — یہ سرمستیٔ احرارِ وطن
ہے اسی نشہ سے یہ گرمی ہنگامۂ کار

انھی خیالات کو بعد میں اکبرؔ اور اقبالؔ نے اپنے اپنے طرز میں اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ "جدید اردو شاعری" کے مصنف لکھتے ہیں :۔

"مسلمانوں کے تنزل کا مرثیہ، حالی عمر بھر پڑھتے رہے۔ شبلی بھی حالی کے ساتھ سوز خوانی میں شریک تھے لیکن حالی مسلمانوں کی پستی کا سبب ان کے مادی امور میں پیچھے رہنے کو سمجھتے تھے۔ شبلی اس کی وجہ اصول اور روایات اسلامی سے انحراف بتلاتے تھے۔

ان حقائق کی بنا پر سبب پستی، قوم
ترک پابندیٔ اسلام ہے اسلام نہیں

"اس کو اکبر نے سچ جانا اور اسی کو اقبال بھی اب تک درست سمجھ رہے ہیں جس کی شاہد عادل اقبال کی آخری دور کی شاعری ہے شبلی کے یہ خیالات ان کی اکثر نظموں میں نئی نئی تشبیہوں اور اچھوتی طرز ادا کے ساتھ نظر آتے ہیں "مساوات اسلام" "عہد فاروقی کے عدل کا ایک نمونہ" "جرأت صداقت" شبلی کی وہ نظمیں ہیں جن سے غالباً اقبال نے بھی "صدیق اکبر، جنگ یرموک کا ایک واقعہ" اور اپنی دوسری اسی طرح کی نظموں کے لئے اشارہ حاصل کیا۔ شبلی کی اسی نوع کی نظموں میں "ہمارا طرز حکومت" اور "عدل جہانگیری" بے حد مقبول ہیں"[۱]

شبلی سے قبل جس طرح اردو نثر تاریخ کی مستند کتابوں سے خالی تھی اسی طرح اردو شاعری بھی تاریخی نظموں سے بالکل تہی مایہ تھی۔ شبلی نے جہاں یورپ کے طرز پر تاریخی کتابیں لکھیں وہاں نہایت موثر اور عمدہ تاریخی نظمیں کہیں۔ اس میدان میں نہ صرف ان کے معاصرین میں سے کوئی ان کے رتبہ کو پہنچ سکا اور نہ ہی بعد کے شعراء میں کوئی وہ مرتبہ حاصل کر سکا۔

---

(۱) صفحہ ۱۳۷، ۱۳۸

شبلی کی تاریخی نظموں کی بڑی خصوصیت واقعہ نگاری اور تحقیق کے علاوہ، غیر معمولی تاثیر، تصویر کشی اور منظر نگاری ہے ان کی کوئی نظم دیکھئے اس میں یہ وصف بہت زیادہ نمایاں اور ممتاز نظر آئے گا۔ مثال کے طور پر "ایثار کی اعلیٰ ترین نظیر" ملاحظہ ہو۔ اسی واقعہ کو ایک اور صاحب ابوظفر نازش رضوی نے بھی نظم کیا ہے دونوں کو پڑھئے تو ان کا فرق نمایاں ہوجاتا ہے پوری نظم نقل کرنا طوالت کا باعث ہوگا اس لئے صرف چند شعر نقل کئے جاتے ہیں۔ واقعہ یوں ہے کہ جنگ احد میں یہ عام غلط فہمی پیدا ہوگئی تھی کہ آنحضرتؐ شہید ہوگئے یہ خبر جب مدینہ پہنچی تو تمام مسلمان سخت پریشان ہوئے۔ بنو دینار کی ایک خاتون موقع جنگ پر دریافت حال کے لئے پہنچیں اس جنگ میں ان کے بھائی، والد اور شوہر نے بھی شرکت کی تھی اور شہادت کی عزت حاصل کی تھی وہ جب موقع جنگ پر پہنچیں تو انھیں اطلاع دی گئی۔ نازش صاحب فرماتے ہیں

آکر کسی نے اس کو اچانک یہ دی خبر | صدمہ بڑا یہ تیرے لئے لاکلام ہے
جنگ احد میں باپ ترا ہوگیا شہید | خلد بریں میں آج سے اس کا قیام ہے
یہ ذکر تھا کہ آکے کسی شخص نے کہا | اے مومنہ یہ صبر و رضا کا مقام ہے
بھائی بھی کام آگیا تیرا جہاد میں | قاصد ابھی یہ جنگ سے لایا پیام ہے
اتنا ہی کہنے پایا تھا وہ مرد نیک خو | ناگاہ یہ پکارا یہ غم کا مقام ہے
شوہر بھی تیرا راہی باغ جناں ہوا | شہدا کی فرد میں لکھا اس کا بھی نام ہے

جب یہ سنا تو تھام کے دل کو وہ مومنہ — بولی کہ یہ مشیت رب الانام ہے
لیکن بتاؤ بہر خدا مجھ ملول کو — کس حال میں حبیب خدائے انام ہے
سب نے کہا کہ زندہ ہے محبوب کردگار — دامان عافیت میں وہ ماہ تمام ہے
جب یہ سنا تو شکر کیا اور یوں کہا — سب کچھ نثار شاہنشہ خاص و عام ہے

شوہر کا باپ بھائی کا مجھ کو نہیں ہے غم
زندہ اگر رسول علیہ السلام ہے

ملاحظہ ہو اس کو شبلی نے چند اشعار میں کس خوبی کے ساتھ نظم کیا ہے اور اس کی تاثیر کس قدر نمایاں ہے۔

موقع جنگ پہ پہنچیں تو یہ لوگوں نے کہا
کیا کہیں تجھ سے کہ کہتے ہوئے شرماتے ہیں ہم
تیرے بھائی نے لڑائی میں شہادت پائی
تیرے والد بھی ہوئے کشتۂ شمشیر ستم
سب سے بڑھ کر کہ شوہر بھی ہوا تیرا شہید
گھر کا گھر صاف ہوا، ٹوٹ پڑا کوہ الم
اس عفیفہ نے یہ سب سن کے کہا تو یہ کہا
یہ تو بتلاؤ کہ کیسے ہیں شہنشاہ اُمم
سب نے دی اس کو بشارت کہ سلامت ہیں حضور
گرچہ زخمی ہیں سر و سینۂ و پہلو و شکم
بڑھ کے اس نے رُخِ اقدس کو جو دیکھا تو کہا

تو سلامت ہے تو پھر ہیچ ہے سب رنج والم
میں بھی اور باپ بھی، شوہر بھی برادر بھی فدا
اے شہ دیں ترے ہوتے ہوئے کیا چیز ہیں ہم

گو یہ مقابلہ صحیح نہیں ہے کیونکہ جن صاحب سے مقابلہ کیا گیا ہے وہ عالم شاعری میں کچھ شہرت نہیں رکھتے لیکن اس سے شبلی کی تاریخی نظموں کی خوبیوں پر ایک حد تک روشنی ضرور پڑتی ہے

متفرق نظمیں

مذکورہ بالا نظموں کے علاوہ مثنوی صبح امید، تماشائے عبرت یعنی قومی مسدس قصیدہ اردو، قصیدہ تہنیت شادی جسٹس سید محمود مرحوم۔ بربادی خاناں شبلی (مرثیہ) اور کچھ قطعات ومطائبات بھی ہیں۔

صبح امید، علی گڑھ کی جدید تحریک سے متعلق اور غالباً مولانا کی پہلی نظم ہے اس کا غیر معمولی حسن قبول اس کی خوبیوں کی دلیل ہے اس میں مسلمانوں کے عروج وزوال کو جس خوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے وہ صرف شبلی کا حصہ ہے۔ بقول سید سلیمان صاحب "اس وقت تک مثنوی صرف قصے کہانیوں کے لئے تھی، ابھی تک اس کو قومی مقصد کے لئے کام میں نہیں لایا گیا تھا، بلکہ اب بھی وہ اس فیض سے گویا محروم ہی ہے، مولانا نے اس راہ میں پہل کی اور وہ چیز جواب تک

میر حسن، مرزا شوق اور پنڈت دیا شنکر نسیم کی سحر بیانیوں سے صرف حسن و عشق اور سحر و طلسم کا تماشا گاہ تھی، وہ قومی ترقی وتنزل کا عبرت انگیز منظر بن گئی، لفظ فصیح، معنی بلند، ترکیبیں دلپذیر، تشبیہ اور استعارے نازک، حشو و زوائد سے پاک اور بیان پر اثر اور یہی چیزیں مثنوی کی جان ہوتی ہیں"[1]

ملاحظہ ہو، گذشتہ مسلمانوں کی کتنی عمدہ تصویر کھینچی گئی ہے۔

وہ قوم کہ جان تھی جہاں کی — جو تاج تھی فرق آسماں کی
تھے جس پہ نثار فتح و اقبال — کسریٰ کو کر چکی تھی پامال
گل کر دئے تھے چراغ جس نے — قیصر کو دئے تھے داغ جس نے
وہ نیزۂ خوں فشاں کہ چل کر — ٹھہرا تھا فرانس کے جگر پر
روما کے دھوئیں اڑا دئے تھے — اٹلی کو کنوئیں جھنکا دئے تھے

موجودہ مسلمانوں کی تصویر بھی ملاحظہ ہو

وہ ابر کہ چھا رہا تھا یکسر — دو دن ہوئے کھل گیا برس کر
پستی نے دبا لیا فلک کو — خورشید ترس گیا چمک کو
اب خضر کو گمرہی کا ڈر ہے — عیسیٰ کو تلاش چارہ گر ہے
جو ابر ابھی برس گیا ہے — اک بوند کو اب ترس گیا ہے
اسلام کی جان پر بنی ہے — دم توڑ رہا ہے جاں کنی ہے

---

(۱) کلیات شبلی صفحہ ۸

لیکن اس کے باوجود قوم کو کوئی احساس نہیں خواب غفلت میں محو ہے شبلی اسے بیدار کرتے ہیں۔

نالاں ہیں کہ اب سے بھی تو جاگو! اے خواب گراں کے سونے والو
آخر کب تک یہ خواب غفلت؟ الٹو تو ذرا نقاب غفلت
تاچند رہو گے مست و سرشار؟ اٹھو کہ سحر ہوئی نمودار
سوچو تو ذرا! کہ حال کیا ہے! کس خواب میں ہو خیال کیا ہے؟
غفلت میں جو شب بسر ہوئی ہے لو اب تو اٹھو! سحر ہوئی ہے

اس مثنوی پر تنقید کرتے ہوئے ایک فاضل نقاد نے لکھا ہے "اس میں سرسید احمد خاں کا جیسا پاکیزہ کردار شبلی نے اشاروں اشاروں میں کھینچ دیا ہے وہ حالی کی 'حیات جاوید' سے بھی نہ ہو سکا "حیات جاوید" میں حالی خارجی طور پر سرسید کے کردار کے اجزا سے بحث کرتے ہیں مثنوی میں شاعر کے جذبات بھی اس میں موجود ہیں۔ اس لیے شبلی کے سرسید زندہ اور اپنے ماحول میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ یہ شاعری کا بڑا کمال ہے"(۱)

ذیل کا ٹکڑا سرسید کی سعی کا صرف ایک رُخ ہے لیکن کس قدر موثر اور واضح

وہ کشتۂ قوم و فدائی اٹھا لئے کاسۂ گدائی

---

(۱) جدید اردو شاعری صفحہ ۱۳۷

ایک ایک سے عرض حال کرتا | در در وہ پھرا سوال کرتا
ہر بزم ہر انجمن میں پہنچا | ہر باغ میں ہر چمن میں پہنچا
کاوش غرض تھی کچھ نہ کد سے | ملتا تھا ہر ایک نیک و بد سے
مردان خدا پرست سے بھی | رندانِ سیاہ بخت سے بھی
گذرا وہ ہر ایک رہ گزر پر | دی اس نے صدا ہر ایک در پر
کس بزم میں یہ فغاں نہ پہنچی | آہ اس کی کہاں کہاں نہ پہنچی

"تماشائے عبرت" سر سید کے قومی تھیٹر کے لئے لکھی گئی۔ اور خود مولانا نے پر درد اور پر سوز لہجہ میں پڑھ کر سنایا تھا۔ مولانا حالی کی مسدس سے اس کا مقابلہ کرنا زیادتی ہے لیکن اس سے اس کے مرتبے میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ یہ اپنی جگہ خوب اور کسی تعریف و تحسین سے قطعی بے نیاز اور حاشیہ آرائی سے بالکل مستغنی ہے۔

مولانا نے اپنے بھائی محمد اسحاق صاحب بی اے ایل ایل بی وکیل ہائی کورٹ الہ آباد کی وفات پر ایک مرثیہ بھی کہا ہے۔ یہ مرثیہ نہ صرف یہ کہ مولانا کی شاعری کا کمال ہے بلکہ اردو کے چند بہترین مرثیوں میں سے ہے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ غالب کے مرثیہ سے "بربادی خانمان شبلی" کہیں بہتر ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف اثر اور درد میں ڈوبا ہوا ہے۔ نا ممکن ہے کہ کوئی اسے پڑھے اور متاثر ہوئے بغیر رہ سکے نا ممکن ہے کہ کوئی اسے پڑھے اور مولانا کے درد و غم میں برابر کا شریک نہ ہو۔ مرثیہ گرئی میں عرب

شعراء کو بہت شہرت حاصل ہے۔ خنسا کو خصوصیت کے ساتھ اس میدان میں بڑی ناموری حاصل ہوئی۔ بڑی قادر الکلام اور بہترین شاعرہ تھی۔ ایک مرتبہ جریر سے پوچھا گیا کہ من اشعر الناس؟ (سب سے بڑا شاعر کون ہے؟) اس نے جواب دیا انا لولا هذه الخبيثة يعني الخنساء (میں اگر یہ خبیثہ یعنی خنساء نہ ہوتی) بشار نے ایک مرتبہ کہا کہ کوئی عورت جب شعر کہتی ہے تو اس میں کمزوریاں ہوتی ہیں کہا گیا کہ کیا خنساء بھی؟ اس نے جواب دیا تلك فوق الرجال (وہ تو مردوں پر بھی فوقیت رکھتی ہے)

اس نے اپنے بھائی صخر اور معاویہ کی موت پر مرثیے کہے ہیں ان میں اس قدر درد اور اثر ہے کہ اس کی مثال کہیں اور ملنی مشکل ہے لیکن میں بلا مبالغہ اور بغیر کسی تامل کے کہہ سکتا ہوں کہ مولانا شبلی کا یہ مرثیہ اس کے بہترین سے بہترین مرثیے کے مقابلہ میں رکھا جا سکتا ہے خنساء کی چند ابیات ملاحظہ ہوں۔

يا عينِ جودي بدمعٍ منكِ مسكوبِ   كلؤلؤٍ جالَ في الاسماطِ مثقوبِ

اے آنکھ تو آنسوؤں کی جھڑی باندھ دے۔ ایک لڑی میں پروئے ہوئے آنسوؤں کی طرح

انّي تذكّرتهُ والليلُ معتكرٌ   ففي فؤادي صدعٌ غيرُ مشعوبِ

میں اس کو یاد کر رہی ہوں اور رات بھیگ چکی ہے۔ اور میرے دل میں بے پایاں درد ہے۔

يا عينِ جودي بالدّمو   عِ المستهلّاتِ السّوافحُ

اے آنکھ آنسو بہا اور موسلا دھار بارش کی طرح بہا۔

فیضاً کما فاض الغروب المترعات من النواضح

اس طرح بہا جس طرح بھرے ہوئے ڈول سے پانی بہتا ہے

انّ البکاء هو الشفا ءمن جوی بین الجوانح

رو اس لئے کہ رونا آتش غم کی کمی اور دل کی ٹھنڈک کا باعث ہے

فابکی لصخرٍ اذ ثوی بین الضریحة والصفائح

میں صخر کے لئے رو رہی ہوں جو قبر میں محو خواب ہے

عینی جوادا ولا تجمدا الا تبکیان لصخرِ الندیٰ

اے میری دونوں آنکھو! آنسو بہائے جاؤ اور کبھی خشک نہ ہونا کیا تم

اس صخر کے لئے نہیں رو رہی ہو جو بڑا فیاض تھا

الا تبکیانِ الجری ءالجمیع الا تبکیان الفتی السیدا

کیا تم آنسو نہیں بہا رہی ہو اس شخص پر جو بہادر اور مستقل مزاج تھا؟ کیا تم اس پر

نہیں رو رہی ہو جو نوجوان اور سردار تھا؟

رفیع العمادِ طویل النجا دِ ساد عشیرتہ امرادا

وہ شریف تھا چھریرے بدن کا تھا۔ اور نوجوانی ہی میں اپنی قوم کا سردار تھا

مولانا شبلی کا مرثیہ طویل ہے پورا نقل کرنا طوالت کا باعث ہوگا

اس لئے صرف چند بند پر اکتفا کیا جاتا ہے

وہ برادر کہ مرا یوسف کنعانی تھا — وہ کہ مجموعۂ ہر خوبیٔ انسانی تھا

وہ کہ گھر بھر کے لئے رحمت یزدانی تھا — قوت دست و دل شبلی نعمانی تھا

جوش اسی کا تھا جو مرے سرِ پُرشور میں تھا
بل اسی کا یہ مرے خامہ پرزور میں تھا
ہم سے ناکاروں کی ایک قوت عامل تھا وہی
مایہ عزتِ اجداد کا حامل تھا وہی
مسند والد مرحوم کے قابل تھا وہی
یوں تو سب اور بھی اعضا ہیں مگر دل تھا وہی
اب وہ مجموعۂ اخلاق کہاں سے لاؤں
ہائے افسوس میں اسحاق کہاں سے لاؤں
تازہ تھا دل پہ مرے مہدی مرحوم کا داغ
کہ مرا قوت بازو تھا مرا چشم و چراغ
اس کو جنت میں کہ خالق نے دیا کنج و فراغ
میں یہ کہتا تھا کہ اب بھی تر و تازہ ہے داغ
یعنی وہ آئینۂ خوبیٔ اخلاق تو ہے
اٹھ گیا مہدیٔ مرحوم تو اسحاق تو ہے
آج افسوس کہ وہ نیر تاباں بھی گیا
میری جمعیت خاطر کا وہ ساماں بھی گیا
اب وہ شیرازۂ اوراق پریشاں بھی گیا
عتبۂ والد مرحوم کا درباں بھی گیا
گلہ خوبیٔ تقدیر رہا جاتا ہے
نوجواں جاتے ہیں اور پیر رہا جاتا ہے

دو بند اور ملاحظہ ہوں۔

یہ بھی اے جانِ برادر کوئی جانے کا ہے طور
اپنے بچوں کی نہ کچھ فکر نہ تدبیر نہ غور
ابھی آنے بھی نہ پایا تھا ترے اوج کا دور
کیا ہوا تجھ کو کہ تو ہو گیا کچھ اور سے اور
چھوڑ کر بچوں کو بے صبر و سکوں جاتا ہے
کوئی جاتا ہے جو دنیا سے تو یوں جاتا ہے

آہ اے مرگ کسی شے کی نہیں تجھ کو تمیز
تیری نظروں میں برابر ہے گہر اور پشیز
میں نے مانا ترے نزدیک نہ تھا وہ کوئی چیز
رحم کرنا تھا کہ چھوڑے ہیں کئی اس نے عزیز
لاڈلے ہیں کہ کسی اور کے بس کے بھی نہیں
اس کے بچے ابھی سات آٹھ برس کے بھی نہیں

مولانا نے میر انیس کی مرثیہ نگاری پر جو کچھ لکھا اور اس کے جو اثرات مولانا کے دل و دماغ پر تھے اگر ان کو پیش نظر رکھ کر اس مرثیہ کو پڑھا جائے تو یقیناً یہ کہنا پڑے گا کہ میر انیس کی زبان فصاحت اور واقعہ نگاری کے ساتھ ساتھ ان کی واقفیت بھی اس طرح سے اس مرثیہ میں پائی جاتی ہے کہ دھوکا ہو سکتا ہے کہ یہ شبلی نہیں بلکہ انیس کے شعر ہیں۔

مولانا حسرت کی رائے ہے کہ "پختگی کلام برجستگی مضمون، آزادی خیال، ندرت بیان اور خوبیٔ طرز غرض کہ ہر حیثیت سے یہ قطعے اپنا جواب ہیں اور کچھ عجب نہیں کہ غالب کے اردو کلام کے مانند رفتہ رفتہ شبلی کی اردو شاعری ان کی فارسی شاعری پر غالب آجائے"[1]

ذیل کا یہ قطعہ خاص طور پر بہت مقبول اور مشہور ہوا۔

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی۔
مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرۃ پیغمبر خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

مولانا کے مطائبات کے متعلق مہدی حسن مرحوم کی رائے ہے کہ "اردو میں ان کے مطائبات نظم کو جو جدید پیداوار ہیں ان کے سلسلۂ کمالات سے علیحدہ کرکے دیکھئے تو بھی ان میں لطائف ادبی کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں یہ رنگ بھی ان ہی کا حصہ ہے شوخی کے ساتھ سنجیدگی، یہ معلوم ہوتا ہے، دور سے زبان کی بلائیں لے رہی ہے"

حضرت اکبر الہ آبادی نے مولانا کو ایک مرتبہ مدعو کیا اور لکھا کہ

---

(۱) تذکرۃ الشعراء جولائی داگست ۱۹۱۵ء

بس بات یہ ہے کہ بھائی شبلی آتا نہیں مجھ کو قبلہ قبلی
کھانا بہت کھاؤ آج کی رات تکلیف اٹھاؤ آج کی رات
سمجھو اس کو پلاؤ قلیا حاضر جو کچھ ہو دال دلیا

مولانا معذرت میں لکھتے ہیں۔

آج دعوت میں نہ آنے کا مجھے بھی ہے ملال
لیکن اسباب کچھ ایسے ہیں کہ مجبور ہوں میں
آپ کے لطف وکرم کا مجھے انکار نہیں
حلقہ در گوش ہوں ممنون ہوں مشکور ہوں میں
لیکن اب وہ میں نہیں ہوں کہ پڑا بھرتا تھا
اب تو اللہ کے افضال سے تیمور ہوں میں
دل کے بہلانے کی باتیں ہیں دگرنہ شبلی
جیتے جی مردہ ہوں، مرحوم ہوں مغفور ہوں میں

غزلیں

شبلی نے غزلیں بہت کم کہی ہیں، صرف ابتدا میں کچھ کہی ہیں، ورنہ آخری دور (۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۴ء) میں جو ان کی اردو شاعری کا امتیازی دور ہے، ان کی جولانیٔ طبع تمام تر نظموں تک محدود رہی اس لئے اگر ان کے تغزل کو دیکھنا ہو تو ان کی فارسی غزلوں کو پڑھنا چاہیئے جس پر خود مولانا کو بھی ناز تھا چنانچہ اپنے

ایک دوست کو لکھتے ہیں: "چند غزلوں کا مجموعہ چھپ رہا ہے تیاری پر بھیج دوں گا، افسوس کہ فارسی لٹریچر کسی قدر غیر معتدل واقع ہوا ہے اور میں بھی اس کو سنبھال نہ سکا، بہر حال مضامین کچھ ہوں، زبان ایران کی ہوگی" عطیہ بیگم کو فارسی ادبیات کے مطالعہ کی ہدایت فرماتے ہوئے لکھتے ہیں: "بوئے گل" بھی اگر تم سمجھ کر پڑھ لو، تو فارسی لٹریچر کی ادائیں کسی قدر معلوم ہوجائیں مولانا حالی مولانا کے فارسی مجموعہ "دستہ گل" کو دیکھ کر اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"کوئی کیوں کر مان سکتا ہے کہ یہ اس شخص کا کلام ہے جس نے سیرۃ النعمان، الفاروق، اور سوانح مولانا روم جیسی مقدس کتابیں لکھی ہیں۔ غزلیں کا ہے کو ہیں، شراب دوآتشہ ہے، جس کے نشہ میں خمار چشم ساقی بھی ملا ہوا ہے۔ غزلیات حافظ کا حصہ محض رندی اور بے باکی کے مضامین پر مشتمل ہے، ممکن ہے کہ اس کے الفاظ میں زیادہ دلربائی ہو، مگر خیالات کے لحاظ سے تو یہ غزلیں اس سے بہت زیادہ گرم ہیں"

مولانا حالی نے، شبلی کی فارسی غزلوں کی جو خصوصیات، لکھی ہیں، وہ بہت حد تک ان کی اردو غزلوں میں بھی پائی جاتی ہیں ذیل میں ایک مختصر انتخاب درج کیا جاتا ہے، ملاحظہ ہو

پوچھتے کیا ہو جو حال شب تنہائی تھا — رخصت صبر تھی یا ترک شکیبائی تھا
شب فرقت میں دل غمزدہ بھی پاس تھا — وہ بھی کیا رات تھی کیا عالم تنہائی تھا
انگلیاں اٹھتی تھیں مژگاں کی اسی رخ پیہم — جس طرف بزم میں وہ کافر ترسائی تھا
میں تھا یا دیدۂ خوننابہ فشاں تھی شب ہجر — ان کو واں مشغلۂ انجمن آرائی تھا
ہم نے بھی حضرت شبلی کی زیارت کی تھی — یوں تو ظاہر میں مقدس تھا پہ شیدائی تھا
تیس دن کے لئے ترک مے و ساقی کرلوں — واعظ سادہ کو روزوں میں تو راضی کرلوں
اور پھر کس کو پسند آئے گا ویرانۂ دل — غم سے مانا بھی کہ اس گھر کو میں خالی کرلوں
شبلی زار سے کہدے کوئی — مژدۂ وصل صبا لائی ہے

یار کو رغبت اغیار نہ ہونے پائے
گل تر کو ہوس خار نہ ہونے پائے
چپکے آتے ہیں وہ گلگشت کو اے باد صبا
سبزہ بھی باغ میں بیدار نہ ہونے پائے
فتنۂ حشر! جو آنا تو دبے پاؤں ذرا
بخت خفتہ مرا بیدار نہ ہونے پائے
آپ جاتے تو ہیں اس بزم میں شبلی لیکن
حال دل کا کہیں اظہار نہ ہونے پائے

طنزیہ شاعری

طنز اور ظرافت ایک دوسرے سے انتہائی قریب ہونے

کے باوجود انتہائی دور ہیں۔ اردو میں ظریف شاعر تو بہت سے مل جائیں گے مگر طنز۔ یہ شاعر انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی :-

جہاں تک طنزیات کا بحیثیت فن اور ادب کے تعلق ہے، اودھ پنچ (لکھنؤ) کے دور سے قبل طنزین کی مثال صرف سودا کی ذات میں ملتی ہے۔ سودا کے عہد میں چند اور طنزیہ شعرا موجود تھے مثلاً میر ضاحک قدوی مکین اور بقا، لیکن ان کو کوئی مستقل حیثیت نصیب نہ تھی گھوم پھر کر نگاہیں صرف سودا، پھر ان کے بعد کسی حد تک انشا اور مصحفی پر پڑتی ہیں۔ انشا اور مصحفی کو مخصوص طور پر طنزین کی صف میں داخل کرنا موزوں بھی نہیں ہے، ہجو و ہجا ان کا مسلک شعری نہ تھا اور نہ اس حیثیت سے ان کو قبول عام نصیب ہوا، ان کی ہجو و ہجا صرف معاصرانہ چشمک کی حد تک تھی۔

سودا کو اردو ہجو و ہجا میں نہ صرف فضل تقدم حاصل ہے، بلکہ ان کے کلام سے طنزیات کی بہترین صلاحیت و استعداد بھی نمایاں ہے۔ لیکن جیسا کہیں عرض کیا گیا ہے بہترین طنز کی اساسی شرط یہ ہے کہ وہ ذاتی عناد و تعصب سے پاک اور ذہن و فکر کی

بے لوث برہمی یا شگفتگی کا نتیجہ ہو۔ اس معیار پر سودا کی ہجویں تمام و کمال پوری نہیں اترتیں تاہم اس خارستان میں بھی طنز و مضحکات کے ایسے نمونے ملتے ہیں، جن سے ان کی زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی کا ہمیں پوری طرح معترف ہو جانا پڑتا ہے[۱]"

شبلی کے معاصرین میں صرف اکبر کے یہاں طنزیہ شاعری کی مثالیں ملتی ہیں، بقول پروفیسر آل احمد صاحب سرور" اکبر کے یہاں طنز و ظرافت کا ایک حیرت انگیز امتزاج ملتا ہے ...... انھیں معلوم ہے کہ لوگ ضرب شدید گوارا کر لیتے ہیں، طنز کا ایک ہلکا سا نشتر برداشت نہیں کر سکتے۔ اس لئے طنز کو ظرافت کا لباس دیتے ہیں[۲]" مگر بقول رشید احمد صاحب صدیقی" لطیف طنزیہ نظمیں لکھنے کا سہرا مولانا شبلی کے سر ہے[۳]"

ظرافت اور طعن و طنز سے قوم کی اصلاح میں بڑا کام لیا جا سکتا ہے لیکن ظرافت ہر ایک کے بس کی نہیں، اس کا تمام تر انحصار طبیعت پر ہے اور شبلی کی طبیعت میں سنجیدگی اور ثقاہت تھی اس لئے انھوں نے دوسرا طریقہ اختیار کیا یعنی طعن و طنز کا اور اس میں وہ پورے کامیاب ہوئے۔

جنگ بلقان کے زمانہ میں سر آغا خاں نے ایک مضمون لکھا تھا جس میں ترکوں کو یہ صلاح دی تھی کہ ان کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ سرزمین یورپ کو چھوڑ کر ایشیا ر چلے جائیں تاکہ وہ دول یورپ

---

(۱) طنزیات و مضحکات صفحہ ۵۴ (۲) تنقیدی اشارے صفحہ ۸۴
(۳) " " " ۴۴

کے حملوں سے محفوظ رہیں اس مضمون سے مسلمانوں میں بہت غصہ پیدا ہوا تھا اور ان کے وقار کو بہت صدمہ پہنچا مولانا نے اس کا طنزیہ جواب دیا ہے نظم طویل ہے۔ مگر شبلی کے طعن وطنز کو اجاگر کرنے کے لئے پوری درج کرنا بھی ضروری ہے۔

ترک سے حضرت آغا نے یہ ارشاد کیا
کیوں ہوئے فائدہ یورپ میں گرفتار الم؟
ایشیا میں اگر آجاؤ تو پھر تا بہ ابد
پاؤں پھیلا کے بڑے چین سے سوؤ گے چہ غم
نظر آجائے گی بے کاری آلات جدید
جب کہ تم وادیٔ تاتار میں رکھو گے قدم
ریل یا تار کی پھر ہوگی نہ حاجت تم کو
ڈاک پہنچانے کو آجائیں گے مرغان حرم
خود ہی کہہ دو گے کہ بے کار ہیں سب تیر وتفنگ
نظر آئے گا جو تیر افگنوں کا عالم
سلک بحری کی ادا دل سے اتر جائے گی
دیکھ لو گے جو کمندوں کا وہ پیچ اور وہ خم
فائدہ کیا ہے کہ تم ریل کا احسان اٹھاؤ؟

---

(۱) کلیات شبلی صفحہ ۶۰

آپ کا اسپ سبک سیر ہے کس بات میں کم؟
آپ صحرا میں چلائیں کے جو خشکی کا جہاز
پھر نہ کچھ بھاپ کی حاجت ہے نہ طوفان کا غم
لطف جو بانگ جرس میں ہے وہ سیٹی میں نہیں
زین کو کہہ نہیں سکتا کوئی ہم پایۂ بم
لمپ کی شعلہ فشانی میں کہاں وہ انداز
شمع کی بزم طرازی کا جو کچھ ہے عالم
فیصلہ بیٹھ کے چوپال میں کر دے گا جو پنچ
ہو گا یورپ کے قوانین سے بڑھ کر محکم
اور مانا بھی کہ فردوس بریں ہے یورپ
حضرت خواجۂ شیراز یہ کرتے ہیں رقم
"پدرم روضۂ رضواں بدو گندم بفروخت
ناخلف باشم اگر من بہ جوئے نفروشم"

طنز کے علاوہ اس کی زبان کتنی عمدہ ہے جو کسی اور طنزیہ شاعر کے یہاں نہ مل سکے گی۔

حادثۂ کانپور کے موقع پر فرمایا ہے ملاحظہ ہو، کتنا کامیاب طنز ہے۔!!

مساجد کی حفاظت کے لیے پولیس کی حاجت ہے
خدا کو آپ نے مشکور فرمایا عنایت ہے

عجب کیا ہے کہ اب ہر شاہراہ سے یہ صدا آئے
مجھے بھی کم سے کم ایک غسل خانہ کی ضرورت ہے

۱۹۱۲ء میں مسلم یونیورسٹی کے نام، الحاق کے اختیار اور آخری فیصلہ کے متعلق مسلمانوں اور حکومت کے درمیان اختلاف تھا حکومت کا رویہ مسلمانوں کے مفاد کے سراسر خلاف تھا جس کی وجہ سے عام مسلمانوں میں بڑا جوش تھا۔ علی گڑھ کے ارباب حل وعقد کو عام مسلمانوں کی یہ دخل اندازی سخت ناگوار تھی مولانا شبلی نے اس پر متعدد طنزیہ نظمیں کہیں جن میں سے "مقدسین علی گڑھ کا قوم پر عتاب" نہایت کامیاب ہے اور یہ صرف مولانا ہی کا حصہ ہے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

ان ابلہان قوم کو سمجھائے یہ کوئی
عالم کے کاروبار کا اک انتظام ہے
جس کی بنا تمام ہے تقسیم کار پر
یعنی ہر ایک شخص کا اک خاص کام ہے
عالم میں ہیں ہر اک کے فرائض جدا جدا
یہ مسئلہ مسلمۂ خاص و عام ہے
ہے مقتدی کا فرض فقط امتثال امر
ارشاد و حکم منصب خاص امام ہے
تھا قوم کا جو فرض وہ تھا بس عطائے زر

آگے مقدسین علی گڑھ کا کام ہے

یہ بارگاہ خاص نہیں مجلس عوام

سمعًا و طاعتہً یہ ادب کا مقام ہے

مخصوص ہیں مناصب خاصان بارگاہ

تم کون ہو جو تم کو یہ سودائے خام ہے

طنز کے لئے زبان پر غیر معمولی قدرت کی ضرورت ہے۔ مولانا شبلی کو یہ قدرت بدرجہ اتم حاصل تھی، اس لئے وہ ایک لفظ سے جو مفہوم ادا کرتے ہیں، دوسرے پورے شعر میں بھی اتنا وسیع مفہوم ادا نہیں کر سکتے "یونیورسٹی اور الحاق" "عرض نیاز بہ جناب مالک الملک" "لیگ کی دائم المرضی کی علت اصلی" "بمبئی کی وفادار انجمن" وغیرہ مولانا کی بہترین طنزیہ نظمیں ہیں، جن کی مثال اردو شاعری میں ملنی ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

خلاصۂ کلام

شبلی کی شاعری کے متعلق، ملک کے ممتاز نقادوں اور سربرآوردہ ادیبوں کی رائیں موقع موقع سے اوپر پیش کی جا چکی ہیں۔ ذیل میں چند رائیں اور پیش کی جاتی ہیں۔ تاکہ شبلی کا اردو شاعری میں جو پایہ ہے وہ اچھی طرح واضح ہو جائے۔

مہدی حسن مرحوم، جو حالی اور شبلی دونوں کے مرتبہ داں تھے

فرماتے ہیں :۔

"اگر اشعار کی لطافت اور خوبی ایک وجدانی چیز ہے اور اس کا سمجھنا ذوق صحیح پر منحصر ہے اور ان خوبیوں کو دکھانا بڑے اہل کمال کا کام ہے تو میں خوش ہوں کہ شبلی حضرت حالی کے حریف مقابل نہ سہی تاہم وہ شاعری کے ملکۂ راسخہ اور ادنیٰ نکتہ سنجیوں کے لحاظ سے اتنی اونچی سطح پر ہیں کہ بڑے بڑے مستشرقین یورپ بھی ان کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے" (۱)

ایڈیٹر الناظر مولانا ظفر الملک دیباچہ مجموعہ کلام شبلی میں لکھتے ہیں "اگر شبلی اپنی تمام قابلیتوں کے ساتھ اردو شاعری اور صرف شاعری کے لئے وقف ہو جاتے تو وہ حالی سے آگے نکل جاتے ان میں ایک شاعر کی تمام قابلیتیں قدرت کی طرف سے ودیعت تھیں اگر یہ دوسرے فردوسی نہیں تو پہلے اقبال ضرور ثابت ہوتے"

قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی فرماتے ہیں :۔

"جس طرح مولانا حالی کی نثر موزونیت الفاظ، ندرت وقوت بیان، اعلیٰ سلیقۂ اظہار خیال کے لحاظ سے مولانا شبلی کی نثر کے مقابلہ میں بلند نہیں ہے اسی طرح ان کی جدید شاعری بھی زور بیان علو جذبات اور کیفیات شعری کے لحاظ سے مولانا شبلی کی شاعری کے

---

(۱) افادات مہدی صفحہ ۱۶۳ - ۱۶۴

مقابلے میں پھیکی اور کم رتبہ ہے اس لئے یہ کہنا بالکل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولانا حالی کی شاعری میں جس بات کی کمی رہ گئی تھی شبلی نے اس کی تلافی کردی اس معاملہ میں ایک کہنہ مشق ادیب اور سخن فہم بزرگ کی رائے ہے کہ حالی کی شاعری سوائے ان کے محدود حلقۂ احباب کے عام طور پر قبول نہیں ہوئی (۱)

مرزا احسان احمد صاحب فرماتے ہیں

"حالی، آزاد وغیرہ نے اردو شاعری کے دائرہ خیال کو جس حد تک وسیع رکھا اس سے کون انکار کرسکتا ہے لیکن سیاسی اور تاریخی نظموں کو غالباً سب سے پہلے مولانا شبلی ہی کا کارنامہ فخر ہے یہ نظمیں دراصل اردو شاعری کے سرمایہ سخن میں ایک قابل قدر اضافہ ہیں جس کو اردو لٹریچر کا کوئی مورخ آسانی کے ساتھ نظر انداز نہیں کرسکتا" (۲)

ایک اور نقاد کی رائے ملاحظہ ہو

"واقعات نویسی میں جو کمال اور سحر بیانی آپ (شبلی) کو حاصل تھا اس کی مثال پیش کرنا آسان نہیں" (۳)

حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان و ادب کی جو خدمت مولانا شبلی نے اپنی بلند پایہ تنقید سے کی ہے اس سے تو کسی کو انکار نہیں

---

(۱) "ہندوستانی" علامہ شبلی بحیثیت شاعر: ایضاً جلد ۱ صفحہ ۲۸۲

(۲) خمخانۂ جاوید جلد ۴ صفحہ ۵۰۴

لیکن ان کی شاعری پر اب تک جس قدر لکھا جانا چاہیے تھا وہ نہیں لکھا جا سکا اور اس کا سبب یہ ہے کہ ہر بڑے شخص کی زندگی اور اس کے کام کے مختلف دور اور اکثر مختلف قسمیں ہوتی ہیں، اور خود اس کے کمال کا ایک پہلو اس کی دوسری خوبیوں کو چھپا لیتا ہے۔

انگریزی ادب میں میتھو آرنلڈ ایک بڑے نقاد کی حیثیت سے مانا جاتا ہے حالانکہ وہ اپنے دور کے شعرا میں ٹینی سن کے بعد سب سے بہتر شاعر بھی تھا بالکل یہی شکل ہماری زبان کے آرنلڈ (شبلی) کی بھی ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ شبلی اپنی دوسری حیثیت میں بھی اپنی صف کے لوگوں میں ممتاز ترین سمجھے جانے کے مستحق ہیں کیونکہ شبلی نے دوسروں کی شاعری پر تنقید اور خود نفس شاعری پر بحث کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے اپنی شاعری میں اس کی پوری طرح پابندی بھی کی ہے

ہم اگر ان کی شاعری کے مختصر سے مجموعے پر ایک گہری نظر ڈالیں تو یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک سچے اور بڑے شاعر کے کلام میں جن خوبیوں کی ضرورت ہے وہ پوری طرح ان کے یہاں موجود ہے۔

ایک بڑے آدمی کا قول ہے کہ اچھا شعر وہ ہے جسے سن کر لوگ فوراً بول اٹھیں، سچ کہا ہے۔ شبلی کی تاریخی نظموں کو پڑھنے

کے بعد یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان کا قلم واقعہ نگاری اور صداقت سے ایک انچ بھی نہیں ہٹا ہے۔ اردو کے ایک نوجوان ادیب نے بڑی سچی بات کہی ہے کہ "زندگی اور ادب ایک دوسرے کا آئینہ ہیں" شبلی کا یہ ایک امتیازی وصف ہے کہ ان کی اردو شاعری، اپنے عہد اور ماحول کی آئینہ دار اور عکاس ہے۔

اب آئیے ذرا شبلی کی شاعری پر فنی اور ادبی نقطۂ نظر سے بھی ایک نگاہ ڈال لیں۔

اٹھتا ہوا شباب یہ کہتا ہے بے دریغ
مجرم کوئی نہیں ہے مگر ہم ضرور ہیں

ہر بزم ہر انجمن میں پہنچا ہر باغ میں ہر چمن میں پہنچا
کس بزم میں یہ فغاں نہ پہنچی آہ اس کی صدا کہاں نہ پہنچی

چھوڑ کر بچوں کو بے صبر سکوں جاتا ہے
کوئی جاتا ہے جو دنیا سے تو یوں جاتا ہے

لاڈلے ہیں یہ کسی اور کے بس کے بھی نہیں
اس کے بچے ابھی سات آٹھ برس کے بھی نہیں

ان شعروں کو پڑھ جائیے اور پھر غور کیجئے کہ زبان کی سلاست بیان کی فصاحت، طرز ادا کی جدت اور بندش کی چستی میں کون سی کمی رہ گئی ہے!

غزل کو قوت منفعلہ کے مظاہر کا مجموعہ ہونا چاہئے۔ ذیل کے

اشعار کو پڑھیے اور دیکھیے کہ ان کی داخلیت میں بھی کتنی سچائی اور اثر ہے۔

پوچھتے کیا ہو جو حال شب تنہائی تھا
رخصت صبر تھی یا وقت شکیبائی تھا
شب فرقت میں دل غمزدہ بھی پاس نہ تھا
وہ بھی کیا رات تھی کیا عالم تنہائی تھا
میں بھی تھا یا دیدۂ خونابہ فشاں تھا شب ہجر
اور وہاں مشغلۂ انجمن آرائی تھا
اور پھر کس کو پسند آئے گا ویرانۂ دل
غم سے مانا بھی کہ اس گھر کو میں خالی کر دوں
فتنۂ حشر جو آنا تو دبے پاؤں ذرا
بخت خفتہ مرا بیدار نہ ہونے پائے

کون کہہ سکتا ہے کہ ایڈیٹر الناظر کا یہ قول کہ "اگر شبلی اپنی تمام قابلیتوں کے ساتھ اردو شاعری کے لئے وقف ہو جاتے تو وہ اگر دوسرے فردوسی نہیں تو پہلے اقبال ضرور ثابت ہوتے" صحیح نہیں۔

اِنڈکس

انڈکس میں صرف وہی نام دیے گئے ہیں، جن کے یا تو اقوال سنداً پیش کیے گئے ہیں یا جن کے متعلق کوئی رائے ظاہر کی گئی ہے۔ شبلی اور حالی کے نام باربار اور بہت کثرت سے آئے ہیں، اس لئے ان کے نام نہیں دیے گئے۔

ابن خلدون۔ ۱۳۶
احتشام حسین، سید۔ ۱۴۷
احسان احمد، مرزا۔ ۲۰۴
احمد میاں جوناگڈھی۔ ۲۰۳
آرنلڈ۔ ۱۳۸
آزاد، مولانا محمد حسین۔ ۳۳-۳۴-۳۶-
۳۷-۳۸-۶۷-۱۰۰-۱۵۰-۱۵۱-
اسٹریچی، لیٹن۔ ۷۷
اقبال۔ ۱۴۵-۱۵۳-۱۸۱-۱۸۲
اکبر الہ آبادی۔ ۱۶۸-۱۶۹-۱۷۰-
۱۷۴-
۱۸۱-۱۸۲-۱۹۳-۱۹۸
براؤن۔ ۹۹-۱۰۰
بکل۔ ۱۳۶
ٹلہری، سید علی اختر اختر۔ ۱۴۶-۱۶۸
ٹیس۔ ۱۲۷
ٹینی سن۔ ۲۰۵
جان گلکرسٹ، ڈاکٹر۔ ۲۰
جوزف کانراڈ۔ ۲۳
چاند، شیخ مرحوم۔ ۶۴
چکبست، پنڈت برج نرائن۔ ۱۶۸-
۱۷۱-۱۷۲-۱۷۳
چوسر۔ ۲۵
رشید احمد صدیقی۔ ۱۹۷-۱۹۸

سجاد ظہیر ۔ ۱۵۳
سُرور، آل احمد ۔ ۱۰۵ ۔ ۱۰۷ ۔ ۱۶۹ ۔ ۱۷۱ ۔ ۱۹۰ ۔
سعید انصاری ۔ ۶۷
سکینہ، رام بابو ۔ ۹۹
سلیمان ندوی، سید ۔ ۵۷ ۔ ۸۹ ۔ ۱۶۴ ۔ ۱۶۷ ۔ ۱۸۵ ۔
سلیم، وحید الدین پانی پتی ۔ ۵۰ ۔ ۶۳
سہیل، مولانا اقبال احمد ۔ ۵۴
شروانی، مولانا حبیب الرحمٰن خاں ۔ ۶۱ ۔ ۶۲ ۔ ۱۲۴ ۔ ۱۲۸ ۔ ۱۳۱ ۔
شوپنہار ۔ ۴۴
شیرانی، مولوی محمود خاں ۔ ۱۰۱ ۔ ۱۰۲ ۔ ۱۰۳ ۔
ظفر الملک علوی ۔ ۲۰۳
عابد حسین، ڈاکٹر سید ۔ ۶۶ ۔ ۱۴۸
عبدالحق، مولانا ۔ ۳۸ ۔ ۵۲ ۔ ۵۸ ۔ ۹۰ ۔ ۱۰۴ ۔ ۱۱۹ ۔
عبدالعلیم احراری، ڈاکٹر ۔ ۱۴۶
عبداللطیف، ڈاکٹر سید ۔ ۲۳ ۔ ۴۵
عبدالماجد دریا آبادی، مولانا ۔ ۴۱
علی عباس حسینی ۔ ۳۹
غالب ۔ ۴۵ ۔ ۴۶ ۔ ۴۷ ۔ ۱۰۶ ۔ ۱۸۸ ۔ ۱۹۳ ۔
فرحت اللہ، مرزا ۔ ۳۹
کارلائل ۔ ۸۰ ۔ ۱۳۶ ۔ ۱۳۹
کانٹ ۔ ۱۳۷
گاس، سر ایڈمانڈ ۔ ۷۶
گبن ۔ ۱۳۶ ۔ ۱۳۸
محمد اکرام ۔ ۴۵
مہدی حسن افادی ۔ ۱۸ ۔ ۵۵ ۔ ۶۷ ۔ ۹۶ ۔ ۱۱۰ ۔ ۱۴۰ ۔ ۱۹۳ ۔ ۲۰۲ ۔
مہر ۔ ۴۵
میتھو آرنلڈ ۔ ۲۰۵
نذیر احمد، مولانا ۔ ۲۱ ۔ ۳۲ ۔ ۳۳ ۔ ۳۷ ۔ ۳۸ ۔ ۶۵ ۔ ۶۷ ۔ ۶۸ ۔
نکلسن، ہرولڈ ۔ ۷۶
والگر ۔ ۴۳
ہیگل ۔ ۱۳۷